مَولانا مُعینُ الدّینؒ اجمیری

تلامذہ کا خراجِ عقیدت

مُرتّبہ

مولانا حکیم محمُود احمد برکاتی

برکات اکیڈمی کراچی

مولانا معین الدین اجمیریؒ

تلامذہ کا خراجِ عقیدت

مرتبہ

مولانا حکیم محمود احمد برکاتی

برکات اکیڈمی کراچی

۲۹۸۔ اے لیاقت آباد نمبر ۴ کراچی

کتاب	مولانا معین الدین اجمیری....
	تلامذہ کا خراج عقیدت
مرتب	مولانا حکیم محمود احمد برکاتی
ناشر	حکیم مجاہد محمود برکاتی، برکات اکیڈمی
	۲۹۸-۱ے، لیاقت آباد نمبر ۴، کراچی ۷۵۹۰۰
	فون نمبر ۴۹۱۸۱۰۰
اشاعت	مارچ ۱۹۹۵ء
ملنے کا پتہ	برکاتی دواخانہ
	عرفان کارنر، بلاک نمبر ۷،
	فیڈرل بی ایریا، کراچی ۷۵۹۵۰
	فون نمبر: ۶۳۱۸۹۴۵، ۶۳۲۸۳۱۴، ۶۳۳۲۸۶۴
طابع	احمد برادرز پرنٹرز، ناظم آباد، کراچی
قیمت	تیس روپے

فہرست

تقریب

مولانا معین الدین اجمیری ماضی قریب کی ایک عظیم اور جامع کمالات شخصیت تھے۔ وہ بیک وقت، ایک مدرس، مصنف، خطیب اور زعیم سیاسی تھے۔

وہ ایک مسند آرا مدرس تھے اور اگر وہ عقلیات میں الافق المبین اور الشفا جیسی ادق کتابیں پڑھاتے تھے تو علوم دینیہ میں صحاح ستّہ کا درس بالالتزام ہر سال دیتے تھے۔

وہ ایک معروف اہل قلم تھے اور منطق اور فلسفے کے معرکہ آرا مسائل پر متعدد رسائل وکتب ان کے زور قلم کے شاہد عادل ہیں تو کئی مختلف فیہ فقہی مسائل پر ان کے بسوط فتاویٰ ان کے تفقّہ کے مظہر ہیں۔

وہ جادو بیاں مقرر اور خطیب بھی تھے، وقت کی جابر و غاصب غیر ملکی حکومت کے خلاف ان کی باغیانہ و بے باکانہ تقاریر،

حکومت کے لیے دردِ سر رہا کرتی تھیں۔

وہ صفِ اول کے زعیم سیاسی بھی تھے۔ مولانا محمد علی جوہر ڈاکٹر انصاری ، حکیم اجمل خان ، مولانا آزاد کے ساتھ برسوں میدان سیاست میں سرگرم رہے ۔جمعیۃ علماء ہند کے نائب صدر اور تحریکِ خلافت کے روح و رواں رہے اور اپنی باغیانہ سرگرمیوں کے ثمرات سمیٹنے کے لیے برسوں فرنگی کے زنداں کی رونق بڑھاتے رہے۔

مولانا علیہ الرحمۃ کی خدمت میں اپنا حقیر نذرانہء عقیدت ایک کتاب کی شکل میں پیش کر چکا ہوں۔ اب ان کے چار سعید و رشید تلامذہ کی تحریریں پیش کر رہا ہوں۔

ان میں سے ایک مقالہ مولانا سید نجم الحسن خیر آبادی مرحوم (ف ۱۹۸۹ء) کا نقش قلم ہے۔ مولانا نجم الحسن، مولانا مرحوم کے عہدِ آخر کے تلامذہ میں سے تھے۔ فراغت کے بعد انھوں نے اپنے آبائی مدرسہء نیازیہ خیرآباد میں مسند درس کو زینت دی اور آخری لمحاتِ حیات تک تقریباً چالیس سال طالبانِ علوم کو مستفید فرماتے رہے اور ان کی وفات پر خیرآباد کی علمی تاریخ کا اختتام ہو گیا۔

مجھ پہ تاریخ کے اک باب کا اتمام ہوا
پھر زمانے نے ورق لوٹ دیا میرے بعد

وہ خیرآباد جس میں صدیوں تک بیک وقت کئی کئی صاحبِ درس اساتذہ سرگرم تدریس رہے، آخر میں وہاں صرف مولانا نجم الحسن کا در وہ واحد در تھا جہاں رازی وطوسی کے نظریات موضوع قیل وقال رہتے تھے۔ مولانا کے خلد بریں میں منتقل ہو جانے کے بعد یہ آخری در بھی بند ہو گیا۔

دوسرا مضمون مولانا محمد اسرائیل یوسف زئی کا ہے۔ طلبِ علم کے آغاز ہی میں دہلی پہنچے، جہاں مولانا حکیم سید برکات احمد کے تلمیذ مولانا عبدالجلیل کے حلقہء درس میں شریک ہوگئے۔ مولانا عبدالجلیل اپنے ٹونکی استاد سے والہانہ نسبت کی بنا پر سرحد و افغانستان میں "ٹونک ملا" مشہور تھے۔ مولانا اسرائیل کچھ دن ٹونک میں میرے والد مرحوم مولانا حکیم سید محمد احمدؒ کے درس میں بھی شریک رہے، مگر ان کی آخری منزل اجمیر ٹھہری جہاں انھوں نے مولانا معین الدین سے خیرآبادی نصابِ درس کی تکمیل کی اور ایران وخراساں کے فلاسفہ کی وہ تمام کتابیں پڑھیں

جو اس عہد متاخر میں صرف خیرآبادی و برکاتی درس گاہوں میں پڑھی اور پڑھائی جاتی تھیں ۔ فراغت کے بعد وطن (صوبہء سرحد) واپس آکر درس و افادہ کی محفل سجائی اور معاصر علماء میں اپنے فضل وکمال کے علم لہرائے ۔

مولانا اسرائیل اپنے مکتبِ فکر (خیرآباد) سے شیفتگی کی بنا پر اپنے نام کے ساتھ مستقلاً " خیرآبادی " لکھا کرتے تھے اور اپنے اساتذہ کی طرح مدۃ العمر مسلک اعتدال پر مستقیم رہے اور علماءِ عصر کے گروہوں میں سے کسی گروہ میں شامل ہونے پر انہیں راضی نہ کیا جاسکا ۔ عرصے تک پشاور یونی ورسٹی سے وابستہ رہے ، وہاں سے وظیفہ یاب ہوکر مطالعے میں صرفِ اوقات فرماتے رہے مجھ سے مسلسل مراسلت رکھتے تھے ۔ کبھی لکھتے میرے ذخیرے میں الجواہر الغالیہ نہیں ہے ، تم اس کا مصورہ (فوٹو اسٹیٹ) بھیج دو کبھی لکھتے آج فلاں کتاب نکالی تو اس کے آخر کے اتنے ورق غائب ہیں ، ان کا عکس بھیج دو ۔ میں اپنی کوئی تالیف پیش کرتا تو ہمت افزائی کی خاطر مبالغہ کر گزرتے ۔ ان کے عزیز مولانا سید لطیف کا انتقال ہوا (جو میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے) تو لکھا کہ کسی

بھی عزیز سے پہلے تمھیں یعنی اپنے آستانۂ علمیہ کو اطلاع دے رہا ہوں ۔ مولانا معین الدین کے سلسلے میں اپنی یادوں کو انھوں نے میری درخواست پر قلم بند کر کے بھیجا تھا جنھیں اس مجموعے میں شائع کیا جارہا ہے ۔

تیسرا مضمون مولانا عبدالشاہد خان شروانی مرحوم (ف ۱۹۸۴ء)کا ہے ۔ مولانا شروانی اور مولانا نجم الحسن رضوی دونوں رفیق درس تھے اور ان دونوں کو مولانا مرحوم کے آخری سنین حیات میں استفادے اور خدمت کی سعادت حاصل ہوئی ، مولانا مرحوم نے کئی مقالات انھی دونوں حضرات کی درخواست پر تحریر یا املا کرائے تھے ۔ مولانا شروانی نے مولانا فضل حق خیرآبادی کے رسالہ عذریہ اور دو قصائد غدریہ کا ترجمہ اپنے طویل مقدمے کے ساتھ " باغیٔ ہندوستان " کے نام سے شائع کیا تھا ، جس میں انھوں نے مولانا مرحوم کے سوانح بھی قلم بند کئے تھے ۔ اس مجموعے میں ہم نے وہ حصہ بھی شامل کر لیا ہے ۔

چوتھا مضمون مولانا عبدالغفور کا ہے ۔ مولانا عبدالغفور علاقہ بنیر (سرحد) کے رہنے والے تھے ۔ برسوں اجمیر میں مولانا

معین الدین سے تحصیل علوم عقلی و دینی کر کے فراغت حاصل کی اور زندگی بھر اسی رنگ میں رنگے رہے۔ اپنے وطن بنیر ہی میں تدریس و افادہ میں اپنے اساتذہ کی طرح خاموشی کے ساتھ منہمک رہے اور خاموشی ہی کے ساتھ یہاں سے وہاں تشریف لے گئے۔

مولانا مرحوم نے یہ مضمون میری درخواست پر لکھ کر ارسال فرمایا تھا۔

محمود احمد برکاتی

حیات اور نظریات

مولانا سید نجم الحسن رضوی مرحوم
خیر آباد، ضلع سیتاپور

استاذ محترم حضرت مولانا معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ یگانہ، روزگار فاضل، متبحر عالم اور عدیم المثال محقق تھے۔ حضرت علامہ جس فضل وکمال کے حامل تھے اس کی مثالیں شاذو و نادر ہی ملتی ہیں۔

ہندوستان صدیوں علوم عربیہ کا گہوارہ رہا ہے۔ اس مردم خیز زمین پر مفسرین، محدثین، فقہا اور علمائے منقول و معقول کثیر تعداد میں پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنے اپنے دور میں علم و حکمت کا چراغ روشن کیا، تشنگانِ علم کو سیراب کیا اور گم گشتگان بادیہ، ضلالت کو نورِ ہدایت سے منور فرمایا۔

فرنگی محل لکھنو کا علمی خانوادہ جو منقولات و معقولات کا جامع تھا، ان سب پر فوقیت لے گیا۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ فرنگی محل

کے حلقہء تلمذ نے بالذات یا بالواسطہ تمام ہندوستان کا احاطہ کرلیا۔

خیرآبادی کا علمی مکتب بھی اسی بحر بیکراں کا ایک چشمہ ہے جس نے اپنے علمی کمالات کی وجہ سے ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی اور سلسلہء خیرآباد ایک مستقل علمی سلسلہ بن گیا۔

اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی حضرت مولانا فضل امام علیہ الرحمہ کی ذاتِ گرامی صفات ہے۔ اس کے بعد دوسری عظیم المرتبت شہرہء آفاق شخصیت مجاہدِ جلیل حضرت مولانا فضل حق علیہ الرحمہ کی ہے۔ ان دونوں کے بعد دوسرا حضرت مولانا عبدالحق علیہ الرحمہ کا نمبر ہے۔

شمس العلما حضرت مولانا عبدالحق خیرآبادی علیہ الرحمہ کے تلامذہ میں جو شخصیت ان سے سب سے زیادہ مستفیض ہوئی، وہ حضرت مولانا حکیم سید برکات احمد صاحب بہاری ثم ٹونکی کی تھی، جنھوں نے بیس سال تک علامہ خیرآبادی سے اکتساب فیض کیا اور جن کی شخصیت نے ٹونک جیسی دور افتادہ چھوٹی سی ریاست کو مرکز معقولات بنا دیا تھا۔ برسہا برس ہندوستان کے مختلف مقامات کے طلبہ اس چشمہء علم و حکمت سے فیض یاب ہوتے رہے۔

- علامہ ٹونکی کی درسگاہ سے جو شخصیتیں آفتاب بن کر چمکیں ان میں حضرت مولانا معین الدین اجمیری علیہ الرحمہ کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ حکیم صاحب کے فضل و کمال کی ریاست علامہ اجمیری کی طرف منتقل ہوگئی، جن کی تدریسی قابلیت اور علمی جامعیت نے ہندوستان بھر میں دھوم مچادی، جس کا اعتراف معاصر علماء و فضلاء کو بھی تھا، خواہ وہ مکتب خیرآباد سے تعلق رکھتے ہوں یا ہندوستان کے دوسرے مکاتب سے۔ بعض معتبر حضرات سے سنا ہے کہ حکیم صاحب کو اپنے تلامذہ میں حضرت علامہ اجمیری اور مولانا حکیم حافظ احمد علی صاحب خیرآبادی پر فخر و ناز تھا

خیرآباد کے علمی مکتب کی خصوصیت اور مولانا کا طرزِ تعلیم اور ذوق مطالعہ

اساتذہ خیرآباد کے طریق تعلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ طالبِ علم کو کتاب کی چار دیواری میں مقید نہیں کرتے ہیں، بلکہ مسائل فن کو اس طرح ذہن نشین کرا دیتے ہیں جس سے طالبِ علم کے اندر مجتہدانہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مقلد محض بن

کر نہیں رہتا بلکہ بہ نظرِ دقیق ہر چیز کا تجزیہ کرتا ہے ۔ اس کے برخلاف دوسرے اساتذہ عبارت پڑھوانے کے بعد ترجمہ کراتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی مطلب بھی بیان کرتے جاتے ہیں، لیکن اساتذہء خیرآباد بقدرِ ضرورت عبارت کا ایک حصہ پڑھوانے کے بعد مسئلہ کی تقریر کر کے اس کے تمام پہلو طالبِ علم کے ذہن نشین کرا دیتے ہیں، اس کے بعد ترجمہ کراتے ہیں تاکہ کتاب سے بھی مطابقت ہو جائے اور عبارت کی پیچیدگیاں دور ہو جائیں ۔

اس طرح فن سے مناسبت پیدا ہو جانے کے بعد جب مشق بڑھ جاتی ہے تو آدمی ذہنی مطالعہ کرنے لگتا ہے ۔ بغیر کتاب کی مدد کے وہ نفس مسئلہ پر باطمینان غور و خوض کرتا رہتا ہے ۔

حضرت علامہء اجمیری کو قدرت نے اس چیز میں ملکہ عطا فرمایا تھا ۔ بغیر کسی کتاب کے گھنٹوں مسائل پر غور و فکر فرماتے رہتے تھے ۔ ایک پھوڑے کا پورا آپریشن اسی ذہنی مکالمہ میں کرا ڈالا اور تکلیف کا احساس تک نہ ہوا ۔ مولوی حافظ حکیم احمد علی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ سلسلہء خیرآباد کی یہ خصوصیت ہے کہ جب نیا سبق پڑھایا جائے تو اس کو ماقبل سے مربوط کر دیا جائے ۔ اس سے طالبِ علم کے ذہن کو مزید انشراح حاصل ہو جاتا ہے ۔

علامہ اجمیری کے حافظہ اور ذہنی مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ مسئلہ وجود، بحث علم و معلوم، مبحث متعلق تصدیق اختلاف در حقیقت تصدیق، بحث مقولات عشر، بحث کلی طبعی جیسے بسوط مضامین زبانی املا کرائے

بجزان مقامات کے کہ جہاں اصل عربی عبارت حوالہ کے لیے پیش کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے کتاب صرف اسی ضرورت کے پیش نظر سامنے رکھی ہے اور جب وہ عبارت نقل کر لی گئی تو پھر کتاب علٰحدہ رکھ کر زبانی املا کرانا شروع کر دیا۔ یہ صورت صرف علوم عقلیہ کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ حدیث و فقہ کے درس میں بھی قوتِ حافظہ کا یہی کرشمہ نظر آتا تھا۔ محدثین اور فقہا کے تمام مذاہب اور احناف کے دلائل ازبر تھے، جنھیں بلاتکلف بیان فرمادیتے تھے۔

اس کے بعد دلائل عقلیہ و نقلیہ سے مذہبِ حنفی کی تائید فرماتے تھے۔ کتبِ صحاح میں ترمذی شریف سے خاص ذوق تھا۔ علامہ ترمذی نے جہاں بھی امام صاحب پر نکتہ چینی کی ہے اس کا بڑی بلیغ انداز میں رد فرماتے تھے۔ حضرت مولانا نے ترمذی شریف کی جامع اور مفصل شرح بھی لکھنا شروع کی تھی، افسوس

کہ عمر نے وفا نہ کی اور یہ کام ناتمام رہ گیا۔ صرف مسح کی بحث تک تحریر فرما سکے۔

عام طور پر حدیث کے درس میں طالبِ علم عبارت پڑھتا تھا اور مولانا مطالب کی توضیح فرماتے جاتے تھے، لیکن کبھی کبھی سلف کے طریقہ پر خود قرأت فرمائی ہے اور طلبہ نے سماعت کی ہے جب ہم لوگ ابو داؤد شریف پڑھ رہے تھے تو ۱۱۔ رمضان المبارک ۱۳۵۸ھ، مطابق ۲۵۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو علامہ نے قرأت کی اور ہم لوگ سامع رہے۔ مشکواۃ شریف کو اہم کتاب سمجھتے تھے۔ علامہ کا خیال تھا کہ اگر مشکواۃ شریف کو سمجھ کر پڑھ لیا جائے تو صحاح کی دوسری کتابیں بہت آسان ہو جاتی ہیں۔ جس زمانہ میں ہم لوگ صحاح کی بعض کتابیں پڑھ چکے تھے، مولانا نے چاہا کہ مشکواۃ شریف شروع کرا دی جائے، لیکن رفقائے درس کا اس بات پر اتفاق نہ ہو سکا کہ اونچے درجہ کی کتاب پڑھنے کے بعد پھر نیچے درجہ کی کتاب پڑھی جائے، اس لیے یہ خیال ترک کر دیا گیا۔

ہدایہ جلد ثالث علامہ کے پسند کی خاص کتاب تھی۔ یوں تو ہدایہ کی چاروں جلدوں کو اہمیت دیتے تھے لیکن جلد اول اور

آخیرین پر خاص زور دیتے تھے۔

اس غیر معمولی حافظہ کے باوجود درس دینے کے لیے تمام کتابوں کا مطالعہ فرماتے تھے۔ میر زاہد، حمد اللہ، شرح ہدایۃ الحکمۃ وغیرہ جن کے مسائل نوک زبان تھے، ان کا بھی اہتمام سے مطالعہ فرماتے تھے۔ اگر کبھی مطالعہ ناغہ ہو جاتا تو اس روز سبق ملتوی فرما دیتے تھے۔ کسی اہم مسئلہ کے سلسلہ میں اس کا اصل ماخذ جو کتابیں ہوتی تھیں، ان کا بھی مقابلہ کرا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ شرح چغمینی کے کسی مسئلہ کے متعلق نفیسی (طب) کا کچھ حصہ پڑھایا تھا۔ شرح ہدایۃ الحکمۃ بحث الہیات میں ایک مقام کے لیے حاشیہ شمسہ جیلانی بر شرح تجرید کا نسخہ جو مولانا عبدالحق صاحب کے مطالعہ میں رہا تھا

نکلوا کر اس کی پوری وہ عبارت نقل کرا دی جو
مقام سے متعلق تھی اور فرمایا کہ یہ مسئلہ علامہ خیرآبادی نے
یہاں سے اخذ فرمایا ہے۔ فن ریاضی کی تکمیل حضرت مولانا لطف

اللہ علی گڑھی سے کی تھی ۔ اس فن کو بڑے شوق و ذوق سے پڑھاتے تھے ۔ شرح چغمینی کے باب پنجم کو بڑی اہمیت دیتے تھے ۔ مولانا کا خیال تھا کہ اس کو صحیح طور پر پڑھانے والے معدودے چند آدمی ہی ہوں گے ۔ قاضی مبارک کی تدریس مولانا کا خاص حصہ تھا اس کے اسباق بڑے جوش و خروش سے پڑھاتے تھے ۔ بعض مقامات کی تقریر میں چہرہ کا رنگ سرخ اور آواز بلند ہو جاتی تھی ۔

بیضاوی شریف کے حواشی میں شیخ زادہ بہت پسند تھا اور بیضاوی شریف پڑھاتے وقت اس کو زیر مطالعہ رکھتے تھے ۔ میر عبدالواحد صاحب بلگرامی کی تصنیف سبع سنابل کے بڑے مداح تھے ۔ فقہ میں علامہ شامی کی ردالمختار کو اہم اور ضروری کتاب سمجھتے تھے ۔ علامہ بحرالعلوم کی رسائل الارکان مستقل مطالعہ میں رہتی تھی ۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی " فتح المنان فی تائید مذہب النعمان " غیر مطبوعہ کے بہت مداح تھے اور مولانا کی خواہش تھی کہ کاش یہ کتاب طبع ہو جائے ۔ مولانا کے ایما پر دہلی میں ایک صاحب کو میں نے کہا بھی تھا جو حضرت شیخ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے ، لیکن کتاب یا اس کی نقل نہ حاصل ہو سکی ۔

ریاضی میں جامع بہادر خانی کی بڑی تعریف فرماتے تھے۔ مفتی صدر الدین صاحب کی تنقیح المقال فی حدیث لاتشد الرحال کو اپنی خاص الماری میں جگہ دی تھی۔ حکیم صاحب کی تصنیف الجنۃ البازغہ کو بڑی پر مغز اور کار آمد کتاب بتلاتے تھے۔ شرح تجرید پر غیاث منصور کے حاشیہ کو (جو نایاب اور غیر مطبوع ہے) بڑی محققانہ اور فاضلانہ تصنیف بتلاتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ بھی فرمایا تھا کہ علامہ خیرآبادی نے انھیں "غیاث العلماء" لکھا ہے۔ ترمذی شریف کی شرح لکھتے وقت مرقات شرح مشکواۃ شریف، عمدۃ القاری شرح بخاری، بذل المجہود شرح ابوداؤد، رسائل الارکان، نیل الاوطار شوکانی اور بحر الرائق پیش نظر رہتی تھیں۔ فرماتے تھے کہ صاحبِ بحر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اصول فقہ کے مباحث بھی ذکر کر دیتے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی علیہ الرحمۃ کی اخبار الاخیار کو معتبر اور مستند کتاب سمجھتے تھے۔ نثار خواجہ کی تصنیف کے وقت منتخب التواریخ بدایونی، سیر الاولیاء، اخبار الاخیار وغیرہ پیش نظر رہیں۔ علامہ کا ذوق مطالعہ درسیات اور ان

کے متعلقات تک محدود نہ تھا۔ قصہ کہانی کی بھی کتابیں ملاحظہ فرماتے تھے۔ عربی الف لیلہ بمبئی سے منگوائی تھی اور دہلی سے بہادر شاہ کے مقدمہ کا پورا سیٹ منگوایا تھا، جس کو ملاحظہ فرماتے رہتے تاریخ پر نظر وسیع تھی، خصوصاً راجپوتانہ اور اجمیر شریف کی تاریخ پر محققانہ نظر تھی۔

حضرت شیخ علی مہائمی قدس سرہ کی بڑی تعریف فرماتے تھے۔ حضرت شیخ نے الم ذلک الکتاب لاریب فیہ تا یؤمنون بالغیب میں بارہ کروڑ تراسی لاکھ چوالیس ہزار پانچ سو چوبیس وجوہ ترکیب کا استخراج کیا ہے۔ آخری دورِ حیات میں تفسیر ابن جریر طبری، فتوحاتِ مکیہ، کشف الظنون فی اسامی الکتب والفنون کی خریداری کا ذوق و شوق پیدا ہوگیا تھا۔ افسوس کہ مولانا کا وصال ہوگیا اور یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔

درس نظامی سے شغف

حضرت مولانا درس نظامی کے پرجوش حامیوں میں تھے۔ آپ کا نظریہ یہ تھا کہ یہی وہ طریقۂ تعلیم ہے جس سے ٹھوس استعداد اور دقت نظر پیدا ہوتی ہے۔ درس نظامی کے خلاف اگر

کوئی لب کشائی کرتا تو غضب ناک ہو کر اس کا رد فرماتے تھے۔

طریقۂ تفہیم

قدرت نے آپ کو یہ ملکہ عطا فرمایا تھا کہ مغلق اور دقیق مقامات کو ایسے واضح اور دل نشیں پیرایہ میں بیان فرماتے تھے کہ متوسط ذہن بھی بآسانی قبول کر لیتا تھا۔ دورانِ درس میں خشونت و خشکی کا کہیں گزر نہ ہونے پاتا تھا۔ مختلف حکایات اور پر لطف اشعار کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اکثر بطور مزاح یہ شعر زبان زد رہتا تھا:

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر جو چاہے تو وہ کل بھینس کے انڈے سے نکال

یہ شعر تو بطورِ تفریح حسبِ موقع پڑھ دیتے تھے، لیکن مولانا کا ذوق شعر بہت بلند تھا۔ خود بھی بلند فلسفی اور حکیم تھے۔

غالب کے اس مصرع پر جھوم جاتے تھے:

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

فرماتے تھے کہ اس مضمون میں کہ دشت کے دیکھنے سے گھر یاد آیا۔ غالب نے عجب برہان قائم کیا ہے۔

غالب کے اس شعر پر (بلکہ پوری غزل پر) وجد فرماتے تھے:

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبہء دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے!

بارہا مومن کا یہ شعر بھی مولانا کو پڑھتے ہوئے سنا:

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں تو نے بھی کیا بیداد کی

غالب کے علاوہ دوسرے بہت سے شعراء کا کلام بھی یاد تھا

مولانا ایک شفیق استاد کی حیثیت سے

اوقاتِ درس کے علاوہ مولانا کی محفل بڑی عجیب ہوتی تھی اس وقت بڑی بے تکلفی سے گفتگو فرماتے تھے - خود اپنے زمانہء طالب علمی اور اس کے بعد کے واقعات سناتے رہتے تھے - تفریح کے پروگرام مرتب کرتے تھے اور ان میں نشاط طبع کے ساتھ اکثر سلسلہء تدریس بھی جاری رہتا تھا - عرصہ تک حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے چلہ پر قیام فرمایا اور وہیں درس دیتے رہے - ان پروگراموں میں بعض مرتبہ تاراگڑھ فائی ساگر، بوراج

کا قیام بھی شامل ہو جاتا تھا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ چاندنی رات میں سامان خورد و نوش ہمراہ لے کر آنا ساگر تشریف لے گئے ہیں اور وہاں کی دلکش اور حسین فضا میں سلسلہ، درس بھی جاری رہا ہے۔

مولانا حکیم احمد علی صاحب قبلہ بیان فرماتے تھے کہ خیرآباد کے سلسلہ، تعلیم میں سہ شنبہ اور جمعہ کو تعطیل ہوتی ہے۔ ہفتہ میں دو دن اس لیے رکھے گیے ہیں کہ اساتذہ تالیف و تصنیف کے لیے وقت حاصل کر لیں اور طلبہ پڑھے ہوئے اسباق پر نظر ثانی کریں۔

مولانا کا بھی اخیر دورِ حیات میں جب تصنیف کی جانب رجحان ہوا ہے اور ترمذی شریف کی شرح لکھنے کا عزم فرمایا ہے تو اکثر ان دو دنوں میں اسباق موقوف فرما دیتے تھے۔

لیکن اسی کے ساتھ عرصہ تک جمعہ کو پابندی سے درس دیا ہے۔ یہ سارا پروگرام ان طلبہ کے لیے تھا جو مدرسہ سے خارج اوقات میں مولانا سے استفادہ کرتے تھے۔ طلبہ کے حال پر شفقت و کرم کا یہ عالم تھا کہ دو ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ مولانا اپنے دستِ مبارک سے کھانے کی سینی لے کر آئے ہیں۔

اگر کبھی کسی طالبِ علم سے ناراض ہو جاتے تھے تو دوسرے وقت اس کی پوری طرح دلجوئی فرماتے تھے۔ سنگین جرم کرنے کے بعد بھی اگر کوئی رسمی طور پر اتنا کہہ دیتا کہ معاف فرمائیے تو فوراً معاف کر دیتے تھے۔ آخری دورِ حیات میں جب عوارض جسمانی نے اضمحلال پیدا کر دیا تھا اس حالت میں بھی درس دینے کی پوری سعی فرماتے رہے۔

جب مولانا محمد شریف صاحب دارالعلوم معینیہ عثمانیہ میں عہدہ صدر المدرسی پر فائز ہو کر اجمیر شریف آئے تو ان کے ہمراہ مولانا شاہ امان اللہ صاحب سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف اور مولانا عون احمد صاحب بھی تھے۔ پھلواری شریف سے ان دونوں حضرات کے پاس خط آیا کہ خواہ ہفتہ میں ایک ہی بار موقع مل سکے ایک سبق تبرکاً حضرت مولانا اجمیری کے پاس ضرور رکھا جائے۔

جب مولانا سے استدعا کی گئی تو پنجشنبہ کا دن مقرر فرمایا۔ شرح ہدایۃ الحکمۃ، بحث الٰہیات شروع کرادی اور راقم الحروف کو حکم دیا کہ ان کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔ بموجب حکم یہ فرض میں

انجام دیتا رہا۔

شب میں مطالعہ کا انداز

شب میں مطالعہ کا انداز یہ تھا کہ لالٹین تیز روشنی کے ساتھ قریب رکھی رہتی اور کتاب سینہ پر ہوتی۔ اگر درمیان میں نیند کا غلبہ ہوتا تو چند منٹ کے لیے آنکھیں بند کر لیتے اس کے بعد پھر مطالعہ شروع فرما دیتے۔ اسی لیے ضخیم کتابوں کی جلد دو حصوں میں بندھواتے تھے، تاکہ مطالعہ میں آسانی رہے۔ یکسوئی کے لیے شہر سے دور گور غربیان کی ایک مسجد کے حجرہ میں قیام فرمایا تھا۔ کبھی جب مطالعہ سے اکتا جاتے تو صحن میں ٹہلنا شروع فرما دیتے۔ مسجد سے چند گز کے فاصلہ پر ایک قبر تھی۔ مولانا نے ایک بار کا اپنا یہ عجیب واقعہ بیان فرمایا کہ شب میں قریب دو بجے کے طبیعت میں الجھن محسوس ہوئی۔ میں صحن میں ٹہلنے لگا۔ اچانک اس قبر پر نظر پڑی تو دیکھا کہ ایک صاحب سفید پوش گنگنا رہے ہیں میں آگے بڑھا اور السلام علیکم کہا۔ میرے یہ کہتے ہی وہ قبر کے اندر غائب ہو گئے۔ رات کا کھانا ایک طالبِ علم مولانا کے لیے گور غریبان لے جاتا تھا۔ اس کا یہ کام تھا کہ کھانا پہونچا دے، شب میں

وہیں قیام کرے اور لالٹین وغیرہ جلا دے۔ اس کے بدلے میں مولانا شب میں ایک کتاب پڑھا دیتے تھے اور کچھ رقم بھی دے دیتے تھے۔ ایک روز اتفاق سے طالبِ علم نہ پہنچ سکا۔ صبح کو جب مدرسہ تشریف لائے تو فخریہ انداز میں فرمایا کہ بھائی رات میں نے لالٹین جلالی۔ یہ عمر میں پہلا اتفاق تھا۔

حکیم صاحب کا احترام اور عظمت

علامہ حکیم سید برکات احمد صاحب علیہ الرحمہ کے علم و فضل کا اکثر تذکرہ فرماتے رہتے تھے۔ مولانا نے درسیات کا بیشتر حصہ حکیم صاحب ہی سے پڑھا تھا۔ (راقم نے مولوی حکیم احمد علی صاحب کو بارہا یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے بہت سے اساتذہ کے یہاں دریوزہ گری کی ہے، لیکن حکیم صاحب کا اندازِ درس بالکل نرالا تھا)۔ مولوی حکیم ظفرالحق صاحب مدظلہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مولانا اجمیری حکیم صاحب سے کبیدہ خاطر ہو کر لکھنو چلے آئے اور یہاں آکر حکیم عبدالعزیز صاحب سے، جو شیخ وقت کہلاتے تھے، قانون شیخ شروع کیا، پہلے ہی سبق میں تین روز صرف ہو گئے۔ مولانا نے حکیم صاحب کو آگے نہ بڑھنے دیا اور نہ حکیم صاحب

مولانا کو مطمئن کر سکے ۔ مایوس ہو کر مولانا نے حکیم صاحب کو معذرت کا ایک خط لکھا جس کا عنوان یہ شعر تھا:

پھرے زمانہ میں چار جانب نگارِ یکتا تمہیں کو دیکھا
حسین دیکھے جمیل دیکھے ولے کہ تم سا تمہیں کو دیکھا

حکیم صاحب خوش ہو گئے اور مولانا کو بلا لیا۔

اسنادِ مبارکہ

حضرت مولانا کو فرنگی محل سے سلسلہء حنفیہ و سلسلہء بحرالعلومیہ کی سند حاصل تھی ۔ مسلسل بالمصافحہ کی سند مولانا اعظم حسین خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی تھی ۔ جن کو حضرت شیخ ظاہر وتری مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اجازت عطا فرمائی تھی اس سلسلہ سند میں مولانا کا ہاتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے تیرہویں نمبر پر تھا ۔ مولانا نے حضرت ظاہر وتری مکی علیہ الرحمۃ سے براہِ راست بھی اجازت حاصل کر لی تھی مسلسل بالضیافۃ کی بھی اجازت آپ اہل ذوق کو دیا کرتے تھے ۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسائل میں مولانا کی تحقیق اور رائے ظاہر کر دی جائے ۔

بیت المال کے قیام کی ضرورت

مولانا کی رائے میں مسلمانوں کی مالی تنظیم کے لیے بیت المال کا قیام ضروری تھا۔ فرماتے تھے کہ اگر یہ نظم قائم ہو جائے تو مسلمانوں کی بہت سی دشواریاں دور ہو جائیں۔ امارتِ شرعیہ کی ضرورت کے بھی قائل تھے۔ موصوف چاہتے تھے کہ اسلامی اصول پر مسلمانوں کی تنظیم کی جائے اور ایک امیر مقرر کیا جائے۔

جے پور کے ہنگامہ میں جب تشریف لے گئے تو وہاں مسلمانوں میں ہجرت کا عام رجحان تھا۔ مولانا کی رائے میں یہ اقدام غلط تھا، ہر چند سمجھانے کی کوشش فرمائی لیکن مسلمانوں پر ہجرت کا رنگ ایسا چڑھا ہوا تھا کہ اس کے خلاف وہ کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ جب مولانا نے یہ دیکھا کہ افہام و تفہیم کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا تو پھر فرمایا کہ اچھا اگر نہیں مانتے ہو تو اپنی جماعت کا ایک امیر مقرر کر لو۔ اس پر وہ راضی ہو گئے اور عبدالرحمن شورگر کو امیر بنا دیا گیا۔

حلوائے شب برات کی رسم

فرماتے تھے کہ ایک بزرگ (غالباً حضرت نجیب الدین

متوکل نام لیا تھا) شب برأت میں تمام رات عبادت فرماتے تھے اور صبح کو روزہ رکھتے تھے۔ وہ عبادت اور صوم کی تقویت کے لئے حلوا تیار کر کے استعمال فرماتے تھے۔ پھر لوگوں میں حلوے کی ایک رسم پڑگئی۔

اختلافی مسائل میں مسلک

اختلافی مسائل (قیام میلاد شریف، فاتحہ وغیرہ) میں مسلک معتدل تھا۔ امکان کذب اور امکان نظیر وغیرہ میں علامہ فضل حق خیرآبادی کے مسلک کے ہم نوا تھے۔ فرماتے تھے کہ ان مسائل میں میں مقلد محض نہیں ہوں بلکہ نظر و فکر کے بعد میں نے انھیں کو صواب سمجھا ہے، لہذا ان کی تائید کر دی۔

حضرت اہلبیت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا بڑا احترام فرماتے تھے اور اس برگزیدہ طبقہ سے خاص شیفتگی تھی۔

ایک مرتبہ ہندوستان کے ایک مشہور عالم کا نام لے کر فرمایا کہ ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا، دوران گفتگو میں انھوں نے ازواج مطہرات کی فضیلت حضرت سیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر اس آیت سے ثابت کی یا نساء النبی لستن کاحد من النساء،

میں نے یہ سن کر کہا کہ مولوی صاحب آیت میں کاحد من النساء کا لفظ ہے۔ حضرت سیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی ہستی احد من النساء میں سے تو ہنیں ہے، وہ تو خود سیدۃ نساء العلمین ہیں۔

بزرگوں کی قبروں پر قبوں کی تعمیر

مزاراتِ بزرگان دین پر جو غیر مشروع افعال ہوتے ہیں، ان کے سختی سے مخالف تھے۔ سجدہ لغیر اللہ کی حرمت پر چار رسالے تصنیف فرمائے ہیں۔ لیکن حضرت اولیاء کرام سے گہری عقیدت تھی۔ بزرگان دین کی قبور پر قبوں کی تعمیر کو جائز سمجھتے تھے اس موضوع پر ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے جو مولانا نور الدین صاحب اجمیری کے نام سے طبع ہوا ہے۔

نماز اشراق کے بارے میں رائے

علماء کا ایک گروہ نماز اشراق اور نماز چاشت کو ایک ہی نماز سمجھتا ہے جو کبھی اول وقت میں ادا کی گئی اور کبھی تاخیر کے ساتھ۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ نے تحریر فرمایا ہے "پس ہر دو را ہم نماز ضحیٰ می تواں گفت و ہم نماز اشراق و متعارف آنست

کہ گفتہ شدو بحقیقت یک وقت است و یک نماز اول وقت آن برآمدن آفتاب است وآخر وے تانزدیک نیم روز وچون در بعض احیان درہر دووقت گزاردہ شد گمان بردہ شد کہ اینجا دووقت است و دو نماز (اشعۃ اللمعات ج ۱، ص ۵۸۸)۔ لیکن حضرات صوفیاے کرام اشراق و چاشت کو دو مستقل نمازیں مانتے ہیں ۔ حضرت مولانا بحرالعلوم فرنگی محلی نے حضرات صوفیہ کے اس مسلک کو حدیث کے مطابق بنانے میں دشواری کا اظہار فرمایا ہے ۔

"وبعض ارباب السلوک یصلون صلوٰتین یسمون احدہما صلوٰۃ الاشراق رکعتین او اربعا وقتہا حین شروق الشمس وارتفاعہا قدر رمح او رمحین الی ساعۃ او ساعتین والاخری صلوۃ الضحیٰ وہی من اربع الی اثنا عشر ووقتہا من بعد الساعتین ۔ الی نصف النہار وہذا التحدید مشکل من جہۃ الاستدلال بالحدیث واللہ اعلم بحقیقۃ الحال"

(رسائل الارکان، ص ۱۴۰)

مولانا حضرات صوفیہ کے مسلک سے متفق تھے ۔ ان کی رائے میں یہ دو علٰحدہ نمازیں ہیں ۔ اشراق کی وہ نماز ہے جس کا ذکر

حدیث ذیل میں آیا ہے :

من معاذ بن انس الجہنی قال. قال رسول الله صلی الله علیه آله من قعد فی مصلاہٗ حین ینصرف من صلواۃ الصبح حتی یسبح رکعتی الضحی لایقول الا خیرا۔ غفر له خطایاہ وان کانت اکثر من زبد البحر رواہ ابوداؤد

(مشکوۃ شریف)

مولانا فرماتے تھے کہ اس نماز کا ثواب اور فضیلت حاصل کرنے کے لیے یہ شرط رکھی گئی ہے کہ بعد نماز فجر اسی جگہ بیٹھ کر ذکرِ الٰہی میں مصروف رہے اور دنیوی گفتگو سے اجتناب کرے۔

حضرات صوفیاے کرام نے اس نماز کا نام اشراق رکھ دیا ہے۔ اور دوسری احادیث میں جن میں بعد نماز بیٹھے رہنے کی شرط نہیں ہے (جن کی بعض روایات میں دو سے بارہ رکعت تک تعداد آئی ہے) وہ اس کے علاوہ دوسری نماز ہے جس کو حضرات صوفیہ کرام چاشت کہتے ہیں، جس کا وقت ربع نہار سے شروع ہوتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ اعتراف فرمایا ہے کہ بعد نماز فجر اسی جگہ بیٹھ کر ذکر میں مشغول

رہنا اور آفتاب بلند ہونے کے بعد دو رکعتیں پڑھنا بعض کے نزدیک مؤکدات میں سے ہے، بخلاف اس نماز کے جو ربع نہار کے بعد ادا کی جائے۔

واین اختلاف (یعنی بدعت، استحباب، کراہت) در نماز است کہ بعد از ربع نہار بگذارند۔ اما آنکہ بعد از نماز فجر مستقبل قبلہ بہ نشینند و بعد بلند شدن آفتاب بگزارند آنرا بعضے از مؤکدات گفتہ اند۔ (اشعۃ اللمعات، جلد اول۔ صفحہ ۵۸۸)

اس سلسلہ میں مولانا نے فرمایا کہ میں ایک مرتبہ مولانا حبیب الرحمن خان صاحب شروانی کا مہمان تھا، میں نے دیکھا کہ انھوں نے فجر کی نماز کے بعد دوسرے مشاغل اختیار کیے پھر کچھ دیر بعد نماز اشراق ادا کی۔ میں نے مولانا سے کہا کہ اس کا ثواب حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ بعد نماز فجر وہیں بیٹھ کر تسبیح و تہلیل وغیرہ میں مشغول رہے اور آفتاب بلند ہونے کے بعد دو رکعتیں پڑھے۔

علم غیب رسول کے متعلق مولانا کا عقیدہ

مولانا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیب دانی کے

منکر نہ تھے - فرماتے تھے کہ اس بات سے انکار ہنیں کیا جاسکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غیبی امور کا علم تھا - البتہ علم غیب (کلی) پروردگار عالم جل شانہ کے ساتھ خاص ہے - اس بحث کو اپنی تصنیف "نثار خواجہ" میں قدرے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے - نثار خواجہ اب نایاب ہو چکی ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پوری عبارت یہاں نقل کر دی جائے -

(ملفوظ حضرت خواجہ، خواجگان خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ "فرمود علم بحریست محیط و معرفت جوئے از محیط" پس خدا کجا و بندہ کجا علم خدا را است و معرفت بندہ را" -

مولانا نے اس کی تشریح عبارتِ ذیل اس طرح فرمائی ہے:

"حضرت خواجہ نے اپنے اس ملفوظ میں دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے - اس نے اس نزاع اور اختلاف کا فیصلہ کر دیا جو عہدِ حاضر کے علما میں جاری ہے - ایک فریق کہتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب ہیں یا حضور کو علم غیب تھا، دوسرا فریق کہتا ہے کہ علم غیب حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے - قرآن کریم میں وارد ہے وما یعلم الغیب الا ہو ٥ غیب کا علم ہنیں ہے

مگر حق تعالیٰ کو۔ پہلا فریق اس کے جواب میں کہتا ہے کہ قرآن میں یہ بھی وارد ہے کہ :فلا یظہر علی غیبہ۔ احدا الا من ارتضیٰ من رسول ٥ حق تعالیٰ اپنے غیب پر کسی کو مطلع ہنیں کرتا مگر اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے مطلع کر دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے رسولوں کو بھی علم غیب ہو جاتا ہے۔ ان آیات میں علماء تعارض دیکھ کر اس کو اپنے اپنے طریق سے دفع بھی کرتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے کی تکفیر و تضلیل میں بتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ حضرات اگر حضرت خواجہ خواجگان کے اس ملفوظ پر غور کر لیتے تو بحث کا خاتمہ ہو جاتا، کیوں کہ جب علم حق تعالیٰ کے جاننے کے ساتھ مخصوص ہے تو علم غیب اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہوگا اور یہ اس کے منافی ہر گز ہنیں ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو غیب پر مطلع کیا۔ غیب پر ان کو مطلع کرنا اور چیز ہے اور علم غیب شئ دیگر۔ غیب کے لیے حسبِ ارشاد حضرت خواجہ یہ ضروری ہے کہ وہ علم کلی غیر محدود ہو اور یہ ظاہر ہے کہ کسی بندہ کا علم خواہ وہ نبی مرسل ہی کیوں نہ ہو غیر محدود ہنیں ہے لیکن علم غیب نہ ہونے سے یہ ہر گز ہنیں لازم آتا کہ ان کو امور

غیبیہ پر منجانب اللہ (تعالیٰ) اطلاع بھی نہ تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک کے واقعات بیان فرمائے ہیں اور یہ سب امور غیب ہیں جو حق تعالیٰ کے بتانے سے آپ کو حاصل ہوئے۔ جب دونوں باتوں میں تعارض ہی نہیں ہے تو اس کے دفع کرنے کی کیا ضرورت، ہر ایک اپنی جگہ پر درست و صحیح ہے اور آیات میں کسی قسم کا تعارض نہیں۔ جس کو حق تعالیٰ نے اپنی ذات کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے وہ علم غیب ہے اور جس کو عام رکھا ہے وہ امور غیبیہ پر اطلاع ہے۔ یہ علمائے عہدِ حاضر کی خوش فہمی ہے کہ وہ دونوں امور (علم غیب اور غیب پر اطلاع) میں منافات سمجھ بیٹھے۔ فقہاء کرام عالم الغیب ہونے کا اطلاق کسی بندے پر نہیں کرتے اور امور غیبیہ پر مطلع ہونا وہ اولیاء کرام تک کے لیے مانتے ہیں۔ انبیاء عظام علیہم السلام کی تو بڑی شان ہے۔ چوں کہ فقہاء کرام و متقدین علما اس رمز سے واقف ہیں جو حضرت خواجہ خواجگان نے بیان کی ہے تو وہ انبیا و اولیا کے لیے اطلاع علی الغیب کا لفظ استعمال کرنے سے باک نہیں کرتے اور کسی جگہ عالم الغیب کا لفظ بجز خدائے تعالیٰ استعمال نہیں کیا۔ اس

عہد کے عام علما چوں کہ اس رمز کو نہیں سمجھتے اس وجہ سے وہ افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے۔ پہلا گروہ بالکل غیب کے جاننے تک کی نفی کر دیتا ہے۔ خواہ وہ انبیاء علیہم السلام ہی کیوں نہ ہوں۔ العیاذ باللہ منہ۔ دوسرا فریق اولیاء کرام تک کو عالم الغیب قرار دیتا ہے۔ چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

ان دونوں فریق کو چاہیے کہ وہ اس ملفوظ مبارک پر غور کر کے اپنی اپنی اصلاح کر لیں اور علم و معرفت کے فرق کو سمجھیں اس فرق کے سمجھنے سے تمام جنگ و جدال کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ یہ عرفان کے علاوہ حضرت خواجہ کا تبحّرِ علمی بھی ہے کہ ایک جملہ سے سب کچھ سمجھا دیا اور مثال دے کر اس کو خوب واضح کر دیا۔

مولانا کی حمیت دینی

علم و فضل کے کمال کے ساتھ مولانا میں غیرت دینی بھی بدرجہ اتم موجود تھی جو ایک عالم ربانی کی شان ہے۔ اسلام یا پیشوایان اسلام کے خلاف کسی گستاخی یا بد تمیزی کو قطعاً برداشت نہ فرما سکتے تھے۔ ایسے موقعوں پر سخت غضب ناک ہو جاتے تھے اور مذہب و پیشوایان مذہب کی طرف سے پوری مدافعت فرماتے

تھے۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی نے رقص و سرود کے جواز پر ایک رسالہ لکھا جس میں نہ صرف قرآن و احادیث سے غلط استدلال کیا بلکہ سلف صالحین اور ائمہ دین کی شان میں بے ادبی اور دریدہ دھنی سے کام لیا۔ حضرت مولانا کی حمیت دینی جوش میں آگئی اس کے رد میں رسالہ رقص چغتائی تحریر فرمایا جو طبع ہو چکا ہے۔ اس رسالہ میں چغتائی کا رد بلیغ اور ان کی تمام تلبیسات کو طشت از بام کیا ہے۔

کتب صحاح میں ایک حدیث مروی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آخر زمانہ میں ایک ایسی قوم ظاہر ہوگی جو نو عمر اور بے وقوف ہوگی۔ جو بات بات میں حدیث زبان پر لائے گی، لیکن اسلام سے ایسی نکلی ہوئی ہوگی جیسے تیر نشانہ سے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ وہ اپنی نمازوں وغیرہ کے سامنے تمھاری نمازوں کو حقیر اور ہیچ سمجھیں گے۔ عام طور پر محدثین اور علما نے یہ دونوں حدیثیں فرقہ خارجیہ پر محمول کی ہیں

لیکن حضرت مولانا کی رائے یہ تھی کہ حضور نبی کریم صلی

اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارکہ جوامع الکلم ہیں - ان کا مصداق جس طرح خوارج ہو سکتے ہیں اسی طرح بعد میں آنے والے گمراہ فرقے بھی ہو سکتے ہیں - اس لیے کہ اس سلسلہ میں دو حدیثیں روایت کی گئی ہیں، ایک میں حدثاء الانسان اور سفہاء الاحلام کے الفاظ ہیں اور دوسری میں اس کے بجائے دوسری علامتیں ہیں یعنی اپنی عبادت کے مقابلہ میں دوسروں کی عبادت کو ہیچ سمجھنا وغیرہ - اس لیے حدثاء الانسان والی حدیث کا وہ نوجوان طبقہ بھی مصداق ہو سکتا ہے جس کے دل و دماغ پر مغربی تمدن و تہذیب کی گہری چھاپ لگ چکی ہے اور جو اسلامی تعلیمات کو بھی مغربی ثقافت و تہذیب کے رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں -

مولانا نے رسالہ رقص چغتائی میں اس پر تفصیل سے بحث فرمائی ہے -

آخری دورِ حیات

مولانا کی تمام عمر علم و دین کی خدمت میں گزری - سفر و حضر، ہر جگہ علمی مشاغل جاری رہتے تھے - آخری لمحہ، حیات تک سلسلہ، تدریس جاری رہا - زندگی کے آخری دو برسوں میں مختلف

عوارض جسمانیہ لاحق رہے۔ عرق النساء کے شدید حملہ نے دونوں پیر مفلوج کر دیے تھے جس کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ دار العلوم معینیہ عثمانیہ سے کنارہ کش ہونے کے بعد گھر پر سلسلہ تدریس جاری رہتا تھا۔ میں اور مولوی شاہد خان صاحب شروانی مستقل پڑھنے والوں میں تھے اور ایک سرحدی طالبِ علم مولوی خواجہ احمد صاحب بھی شریک ہو جاتے تھے۔ جب وہ اپنے وطن چلے گئے تو پھر ہم ہی دونوں باقی رہ گئے تھے۔ یا پھر صاحبزادہ عبدالباقی سلمہ کو کبھی تنہا اور کبھی ہم لوگوں کے ساتھ کچھ کتابیں پڑھا دیتے تھے۔

جسمانی انحطاط یوماً فیوماً ترقی کر رہا تھا مگر مولانا اپنی بلند ہمتی سے اس وقت تک درس دیتے رہے جب تک کہ قوتِ گویائی نے جواب نہ دے دیا۔ یکم محرم ۵۹ھ سے حالت میں مزید ابتری پیدا ہو گئی تھی۔ درمیان میں دو ایک روز افاقہ رہا۔ یہاں تک کہ ۱۰۔ محرم ۵۹ھ کو ڈھائی بجے دن میں یہ آفتابِ علم و فضل ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ میر احدی اجمیری نے فی البدیہہ حسبِ ذیل قطعہ تاریخ کیا:

قطعہ

ہے سنہ تیرہ سو انسٹھ عشرہء ماہِ محرم ہے
ہمیں اس ابتدائی ماہ میں بے انتہا غم ہے
امام الوقت مولانا معین الدیں کی رحلت سے
بپا اجمیر میں امسال ایک دہرا محرم ہے

رحمہ اللہ تعالیٰ وغفرلہ

مولانا کی تصانیف

مولانا کی تصانیف کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ کتابیں ہیں جو خود مولانا کے نام نامی کے ساتھ شائع ہوئی ہیں دوسری وہ کتابیں جو مولانا کی تصنیف ہیں لیکن دوسروں کے نام سے ان کی طباعت عمل میں آئی ہے۔ دونوں قسم کی کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے:

۱۔ شرح ترمذی شریف (عربی)

قلمی۔ مسح کی بحث تک، بہت مفصل اور جامع عربی زبان میں یہ شرح ہے۔

۲۔ رسالہ فضیلت قران (عربی)

حج میں یہ بہ نیت اور افراد کے قران کے افضل ہونے پر یہ رسالہ عربی میں تحریر فرمایا ہے۔ غیر مطبوع ہے، ضخامت کاپی سائز پر ۹ صفحات گنجان کتابت۔

۳۔ رسالہ ما اہل بہ لغیر اللہ (اردو)

اس موضوع پر یہ بہت ہی جامع اور نافع رسالہ ہے اب تک طبع ہنیں ہوا ہے۔ اس رسالہ میں ما اہل سے ماذبح مراد ہونے

پر پرزور استدلال کیا گیا ہے اور منکرین کے خیالات کی تردید کی گئی ہے ۔ ضخامت کاپی سائز ۱۶ صفحات ۔

۴ ۔ اسعاف (اردو)

سجادگی اور تولیت اوقاف پر شرعی حیثیت سے اس رسالہ میں بحث کی گئی ہے ۔ علمائے عرب و عجم کا مصدقہ ہے ۔ ضخامت ۳۲ صفحے ۔ حضرت مولانا معین الدین صاحب اجمیری کے نام سے باہتمام مولوی یونس صاحب سابق منتظم دارالعلوم معینیہ عثمانیہ خواجہ برقی پریس، دہلی میں طبع ہوا ہے ۔

۵ ۔ نثار خواجہ (اردو)

مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس (دہلی)

یہ حضرت خواجہ، خواجگان خواجہ اجمیری قدس سرہ کی جامع اور مستند سوانح عمری ہے ۔ مولانا کے نام سے طبع ہوئی ہے ۔ چودھری محمد بخش صاحب رئیس کہٹیار (بہار) نے طبع کرائی ۔

۶ ۔ حیات طیبہ (اردو)

مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی ۔ ضخامت ۱۲۴ صفحات نواب عبدالواحد علی خان رئیس بڈھانسی ممبر کونسل

مولانا کی تصانیف

مولانا کی تصانیف کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ کتابیں ہیں جو خود مولانا کے نام نامی کے ساتھ شائع ہوئی ہیں دوسری وہ کتابیں جو مولانا کی تصنیف ہیں لیکن دوسروں کے نام سے ان کی طباعت عمل میں آئی ہے۔ دونوں قسم کی کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے:

۱۔ شرح ترمذی شریف (عربی)

قلمی۔ مسح کی بحث تک، بہت مفصل اور جامع عربی زبان میں یہ شرح ہے۔

۲۔ رسالہ فضیلت قران (عربی)

حج میں یہ بہ نیت اور افراد کے قران کے افضل ہونے پر یہ رسالہ عربی میں تحریر فرمایا ہے۔ غیر مطبوع ہے، ضخامت کاپی سائز پر ۹ صفحات گنجان کتابت۔

۳۔ رسالہ ما اہل بہ لغیر اللہ (اردو)

اس موضوع پر یہ بہت ہی جامع اور نافع رسالہ ہے اب تک طبع نہیں ہوا ہے۔ اس رسالہ میں ما اہل سے ماذبح مراد ہونے

پر پرزور استدلال کیا گیا ہے اور منکرین کے خیالات کی تردید کی گئی ہے۔ ضخامت کاپی سائز ۱۶ صفحات۔

۴۔ اسعاف (اردو)

سجادگی اور تولیت اوقاف پر شرعی حیثیت سے اس رسالہ میں بحث کی گئی ہے۔ علمائے عرب و عجم کا مصدقہ ہے۔ ضخامت ۳۲ صفحے۔ حضرت مولانا معین الدین صاحب اجمیری کے نام سے باہتمام مولوی یونس صاحب سابق منتظم دارالعلوم معینیہ عثمانیہ خواجہ برقی پریس، دہلی میں طبع ہوا ہے۔

۵۔ نثار خواجہ (اردو)

مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس (دہلی)

یہ حضرت خواجہ، خواجگان خواجہ اجمیری قدس سرہ کی جامع اور مستند سوانح عمری ہے۔ مولانا کے نام سے طبع ہوئی ہے۔ چودھری محمد بخش صاحب رئیس کٹھیار (بہار) نے طبع کرائی۔

۶۔ حیات طیبہ (اردو)

مطبوعہ دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی۔ ضخامت ۱۲۴ صفحات

نواب عبدالواحد علی خان رئیس بڈھانسی ممبر کونسل

ریاست جے پور کی سوانح عمری ہے جو مولانا نے تحریر فرمائی اور مولانا ہی کے نام سے طبع ہوئی ہے ۔ نواب صاحب نے مولانا کے ساتھ اس وقت ہمدردی اور خلوص کا ثبوت دیا جب مولانا ۱۹۲۲ء میں اسیر قید فرنگ تھے اور قریب ترین اعزا بھی بوجہ خوف ملاقات سے دست کش ہو گئے تھے ۔ مولانا ابھی اسیر ہی تھے کہ نواب صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا ۔ اس حادثہ نے مولانا کے قلب کو ازحد متاثر کیا ۔ اس کتاب میں ان باتوں کو تفصیل سے تحریر فرمایا ہے ۔

۷ ۔ القول الاظہر فیما یتعلق بالاذان عندالمنبر (اردو)

مطبوعہ نظامیہ، حیدر آباد دکن ۔ ضخامت ۶۴ صفحات

یہ رسالہ مولانا ہی کے نام سے طبع ہوا ہے ۔ اس میں حدیث وفقہ کی روشنی میں یہ ثابت فرمایا ہے کہ جمعہ کی دوسری اذان منبر کے نزدیک مسجد کے اندر ہونا چاہیے ۔ بہت ہی کارآمد رسالہ ہے ۔ کچھ عرصہ ہوا حیدر آباد میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہو گیا ۔

۸ ۔ تجلیات انوار المعین (اردو)

مطبوعہ مطبع صدیقی۔ ضخامت صفحات ۴۷

القول الاظہر کے رد میں بریلی سے ایک رسالہ (غالباً اجلی انوارالرضا نام ہے) شائع ہوا تھا۔ تجلیات انوارالمعین اس کا جواب ہے جو مولانا نے سیٹھ ظہور محمد رئیس پیپاڑ (مارواڑ) کی فرمائش پر تحریر فرمایا ہے۔

۹۔ خطبہ صدارت اجلاس نہم جمعیۃ علماے ہند۔

ضخامت صفحات ۳۸۔ مطبوعہ نادر برقی پریس، بلی ماران دہلی

امروھہ میں ۳ لغایت ۶۔ ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ مطابق ۳ لغایت ۶۔ مئی ۱۹۳۰ء جمعیۃ العلما کا اجلاس زیر صدارت مولانا معین الدین صاحب اجمیری منعقد ہوا تھا۔ یہ اسی کا خطبہ صدارت ہے۔

۱۰۔ رسالہ استعارہ (عربی)

غیر مطبوعہ کاپی سائز صفحات ۱۱

استعارہ کی بحث کتب بلاغت میں بہت ہی طویل ہے جس کا ضبط کرنا طلبہ کے لیے دشوار ہوتا ہے۔ یہ مختصر رسالہ اسی

ضرورت سے لکھا گیا ہے تاکہ طلبہ آسانی سے یاد رکھ سکیں۔

۲۷۔ شوال ۱۳۵۸ھ مطابق ۹۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو مولانا اس رسالہ کی تالیف سے فارغ ہوئے۔ ۸ بجے دن سے ۱۲ بجے تک دن کے تصحیح اور نظر ثانی کے سلسلہ میں راقم سطور بھی مولانا کی خدمت میں حاضر رہا۔

۱۱۔ چہل حدیث مع ترجمہ اردو

صفحات ۸۔ مطبوعہ غنی المطابع، دہلی

مقامات مقدسہ کی فضلیت میں یہ چہل حدیث مولانا نے مرتب فرمائی ہے، جس کا ترجمہ صاحبزادہ مولانا ہاشم جان صاحب سندھی نے کیا ہے۔ مولانا ہی کے نام سے طبع ہوئی ہے۔ اس چہل حدیث کے علاوہ ایک چہل حدیث اور مولانا کی تصنیف ہے جو راقم الحروف کی نظر سے ہنیں گزری۔

۱۲۔ کلمہ حق (اردو)

مجلس خلافت اجمیر شریف نے مطبع مصطفائی، دہلی میں طبع کرایا۔ صفحات ۶۴

اس رسالہ میں مولانا نے کفار کے ساتھ موالات پر قرآن و

حدیث اور اقوال فقہاء کی روشنی میں تفصیل سے بحث کی ہے۔
قاری طاہر حسن صاحب امام عیدگاہ دہلی کی تصحیح کے ساتھ مولانا
کے نام سے رسالہ طبع ہوا ہے۔

۱۳- رقص چغتائی

مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس، دہلی۔

ضخامت صفحات ۳۸

مرزا عظیم بیگ چغتائی کے رسالہ رقص و سرود کے رد میں
حضرت مولانا نے یہ رسالہ تحریر فرمایا ہے۔ جو سیٹھ ظہور محمد
صاحب رئیس پیپاڑ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس رسالہ میں
چغتائی صاحب کے عقائد فاسدہ کی بلیغ انداز میں تردید فرمائی ہے۔

۱۴- رسالہ پکی قبروں اور قبوں کا جواز

مطبوعہ برقی پریس، دہلی۔ مارچ ۱۹۲۶ء، صفحات ۴۸

رسالہ کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ مولانا نور الدین
صاحب اجمیری کے نام سے شائع ہوا ہے۔

۱۵- تنبیہ الساجد لغیر اللہ الواحد

مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس، دہلی۔ صفحات ۴۴

سجدہ لغیر اللہ کی حرمت میں سیٹھ ظہور محمد صاحب کے نام سے یہ رسالہ طبع ہوا ہے۔

۱۶۔ النص الظاہر علیٰ ان المسجود ہو القاہر

مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس، دہلی۔ صفحات ۴۶

سجدہ لغیر اللہ کی حرمت میں یہ دوسرا رسالہ مولوی حبیب اللہ صاحب فضائی کے نام سے شائع ہوا ہے۔

۱۷۔ کف الجباہ عن السجدۃ لغیر اللہ

مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس، دہلی۔ صفحات ۲۴

سجدہ لغیر اللہ کی حرمت میں یہ تیسرا رسالہ مولوی محمد حسین صاحب راندیری کے نام سے شائع ہوا ہے۔

۱۸۔ النص المقصود علیٰ ان المعبود ہو المسجود

مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس، دہلی۔ صفحات ۲۴

سجدہ لغیر اللہ کی حرمت میں یہ چوتھا رسالہ مولوی محمد اللہ صاحب جے پوری کے نام سے شائع ہوا ہے۔

۱۹۔ مسئلہ الدہر (اردو)

مسئلہ دہر پر مولانا کا محققانہ رسالہ جو رسالہ ریاض کراچی

کے کسی شمارہ میں مکمل طبع ہوا ہے۔

۲۰۔ رسالہ علم و معلوم (اردو مطبوعہ)

رسالہ بینات کراچی کے ۱۹۶۴ء کے چار شماروں میں شائع ہوا ہے۔ یہ بحث مولانا نے مجھے اور مولوی شاہد خان صاحب شروانی کو املا کرائی تھی جس کا اختتام ۱۴۔ ربیع الثانی ۵۸ ھ کو ہوا تھا۔

۲۱۔ رسالہ وجود (اردو)

غیر مطبوعہ۔ ضخامت کاپی سائز صفحات ۴۴

سب سے پہلے یہی بحث مولانا نے املا کرائی تھی جس کا اختتام ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ کی کسی تاریخ میں ہوا تھا۔

۲۲۔ بحث وجود رابطی (اردو)

غیر مطبوع۔ ضخامت صفحات ۱۶

۱۲۔ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۸ھ کو اس کے املا سے ہم لوگ فارغ ہوئے تھے۔

۲۳۔ بحث متعلق تصدیق (اردو)

غیر مطبوع۔ ضخامت ۱۴۰

اس بحث کے املا کا آغاز ۲۲ جمادی الاخری ۵۸ھ اور اختتام ۲۴ رجب ۵۸ء کو ہوا تھا۔

۲۴۔ بحث اختلاف در حقیقت تصدیق (اردو)

غیر مطبوع۔ صفحات ۵

آغاز املا از ۲۵۔رجب ۵۸ھ اختتام ۴ شعبان ۵۸ء

۲۵۔ بحث مقولات عشر (اردو)

غیر مطبوع۔ صفحات ۳۴

اس کے املا کا آغاز ۸۔ شعبان ۱۳۵۸ھ کو ہوا تھا۔ تاریخ فراغت نا معلوم۔

۲۶۔ بحث کلی طبعی (اردو)

غیر مطبوع۔ صفحات ۱۷

۱۵۔ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ کو اختتام ہوا۔

۲۷۔ چہار تازیانہ قہار (مطبوعہ اردو)

مولانا عبدالوہاب صاحب فخر بہار نے علامہ مولانا عبدالحق صاحب خیر آبادی پر اعتراضات کیے تھے۔ اس رسالہ میں اس کا جواب ہے۔

۲۸۔ ازاحۃ شبہات الشادی عن کلام الفاضل الخیرآبادی

(عربی)

مطبوع۔ صفحات ۹۶

مولانا فضل حق صاحب رام پوری نے علامہ عبدالحق خیر آبادی کے حاشیہ امور عامہ پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ مولانا اجمیری نے اس رسالہ میں اس کا جواب دیا ہے۔ مفید عام اسٹیم پریس، لاہور، ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۷ء

۲۹۔ ازاحۃ اوہام الغفول (عربی)

مطبوع

ازاحۃ شبہات الشادی کے جواب میں مولانا غلام محمد صاحب گوٹوی نے رسالہ "ظفر الحق والصداقۃ" تحریر کیا تھا ازاحۃ الغفول میں اسی کا جواب دیا گیا ہے۔

۳۰۔ نعت مفردات اردو، عربی

غیر مطبوع

آخری دور حیات میں مولانا نے قدیم و جدید اردو الفاظ کی مختصر عربی نعت تحریر فرمانا شروع کی تھی۔ یہ نعت ردیف ب سے

شروع کی گئی ہے ۔ پہلے اردو الفاظ میں اس کے بعد ان کی عربی درمیان میں فارسی کا خانہ رکھا تھا مگر موت کا وقت موعود آپہونچا۔

۳۱۔ بخاری شریف پارہ اول کے توضیحی حاشیے (قلمی)

مولوی وحید الزمان خان صاحب نے بخاری شریف کے توضیحی حواشی میں حنفیہ پر رکیک حملے کیے ہیں۔ اس کے پیش نظر مولانا نے حاشیہ لکھنا شروع کیا تھا۔ تاج کمپنی نے اس کی طباعت کا وعدہ کیا تھا۔ صرف پہلے پارہ کے حواشی تمام ہو سکے۔

یاد استاد

مولانا محمد عبدالشاہد خان شیروانی مرحوم
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

میں رجب ۱۳۵۴ھ کے پہلے ہفتے میں بسلسلہء عرس حضرت خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ اجمیر حاضر ہوا تھا۔ اس وقت خیرآباد میں ہدایہ ، بیضاوی ، میر زاہد رسالہ و غیرہا زیر درس تھے۔ دارالعلوم معینیہ عثمانیہ کے دورہء حدیث کے طلبہ کے امتحان اور دستار بندی کے سلسلے میں حضرت میر نثار احمد متولی درگاہ و مہتمم دارالعلوم کے دولت کدہ پر علما و مشائخ کا اجتماع تھا۔ میں بھی حاضر ہو گیا۔ سب سے پہلے یہیں حضرت الاستاذ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ اس اجتماع افاضل میں علم و فضل کا یہ بلبل چہک رہا تھا، گفتگو میں سب پر چھایا ہوا تھا، ہر بات دلنشیں ہوتی چلی جاتی تھی۔ جی نے اسی ڈیوڑی کی دریوزہ گری کی ٹھانی، دوسرے وقت درِ دولت پر حاضر ہو کر مدعا ظاہر کیا، بڑی خندہ پیشانی سے شرفِ

پذیرائی بخشا گیا۔ میں خیرآباد واپس پہنچا اور وہاں سے رخصت ہو کر مکان اور مکان سے ۴۔ شعبان ۱۳۵۴ھ مطابق یکم نومبر ۱۹۵۳ء کی صبح کو واردِ اجمیر ہوا، دولت کدہ پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہسپتال میں صاحبِ فراش ہیں، اریٹھہ پھوڑا گردن پر نکلا تھا جس کا آپریشن ہو چکا ہے۔ میں سیدھا ہسپتال پہنچا۔ حضرت چارپائی پر استراحت فرما تھے۔ اردگرد تلامذہ اور عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ کچھ دیر بعد باریابی ہوئی۔ مسرت و شفقت کا اظہار فرماتے ہوئے وہیں قیام کا حکم دیا۔ تقریباً دو ہفتے وہاں رہ کر خدمت کی سعادت نصیب ہوئی۔

اس پھوڑے کی رگیں مغز دماغ تک پہنچ گئی تھیں۔ چناں چہ آپریشن کے وقت آلات سے ایک ایک رگ کو نکالا گیا اور یہ سن کر حیرت ہو گی کہ ادویہ، بے ہوشی وغیرہ کے بغیر آپریشن کرایا۔ فرماتے تھے کہ فلسفہ کا ایک مسئلہ سامنے رکھ لیا تھا اس کے حل کرنے میں منہمک ہو گیا اور اس کا پتہ بھی نہ چلا کہ گوشت کہاں سے اور کتنا کاٹا گیا۔ جو لوگ موجود تھے وہ بھی حیرت زدہ تھے، یہ تھا علمی استغراق!

ہسپتال سے نکل کر کچھ دن کے لیے تبدیل آب و ہوا اور

ضروریاتِ دارالعلوم حنفیہ صوفیہ اجمیر کے پیش نظر احمد آباد کا سفر فرمایا۔ میں بھی ہمرکاب رہا۔ رمضان میں واپسی ہوئی۔ شوال میں میرے ہمدرس ورفیق عزیز مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی کے پہنچ جانے پر سلسلہء درس شروع ہوا، چناں چہ ۲۲۔ شوال ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۸۔ جنوری ۱۹۳۶ء شنبہ کو حمد اللہ، ہدایہ اولین، شرح ہدایۃ الحکمۃ اور میر زاہد رسالہ کے اسباق شروع کرائے گئے۔ ہم دونوں کو اپنے دولت کدہ پر ہی رہنے کا حکم دیا۔ اس وقت تارا گڑھ کے راستہ میں پہاڑی پر ایک مکان میں اہل وعیال کا قیام تھا خود حضرت شہر سے دو میل دور گورِ غریباں کی ایک مسجد سے متصل حجرہ میں قیام فرماتے تھے۔ وہیں حضرت کا کتب خانہ تھا۔ دو تین طلبہ بھی وہاں رہتے تھے جن کا کھانا پہاڑی سے تیار ہو کر وہیں پہنچتا تھا۔ صبح کی نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر دو میل چل کر دارالعلوم معینیہ عثمانیہ درگاہِ معلیٰ کی مسندِ تدریس کو رونق بخشتے ۱۲ بجے تک سات آٹھ اسباق پڑھا کر ٹھیک دوپہر میں چار، پانچ فرلانگ چڑھائی کی مسافت طے کر کے پہاڑی پر تشریف لاتے۔ کھانا تناول فرما کر کچھ دیر قیلولہ کر کے ظہر کی نماز جماعت سے ہم

لوگوں کے ساتھ ادا فرماتے اور ہمیں عصر تک پڑھاتے رہتے۔ عصر کی نماز جماعت سے پڑھ کر اپنے مستقر گورِ غریباں چلے جاتے۔ شب کو وہیں مطالعۂ کتب، فتویٰ نویسی اور دوسرے علمی مشاغل میں مصروف رہتے۔ یہ معمولات جاڑے، گرمی اور برسات تینوں موسموں میں اسی التزام کے ساتھ پورے فرماتے۔ ان تین طلبہ کے ساتھ ہم دونوں کا کھانا بھی اندر ہی پکتا۔ ایک خرد سال صاحبزادی اور بی بی صاحبہ کے سوا کوئی ملازمہ بھی نہ تھی۔ خلفِ رشید مولوی عبدالباقی سلمہ، جن کی عمر اس وقت چودہ، پندرہ سال تھی، کھانا لاکر ساتھ کھاتے اور اس کے بجائے کہ ہم خدمت کرتے الٹی ہماری خدمت کرتے۔ اس پر بھی حضرت کا اصرار یہی تھا کہ ہمارے کھانے کا بار خود اٹھائیں۔ بڑی التجاؤں کے بعد یہ صورت گوارا فرمائی گئی کہ جتنے افراد کا کھانا پکتا ہے اور جتنا اس پر صرف ہوتا ہے اسی حساب سے مصارف ادا کئے جائیں چناں چہ آخر تک یہی سلسلہ رہا۔ اہل و عیال کی تربیت اس طرح فرمائی تھی کہ بچوں کو کبھی اچھا کھانے اور اچھا پہننے کی طرف راغب نہ دیکھا۔ باقی میاں سلمہ کے متعلق جب کبھی ہم لوگ توجہ دلاتے تو فرماتے کہ ان کو

طالبِ علم بن کر ہی رہنے دو۔ صاحبزادہ بنا کر رکھا گیا اور تم میں سے کبھی کوئی میرے بعد ادھر آنکلا تو کوئی بات پوچھنے والا بھی نہ ملے گا۔

بیوی صاحبہ کا یہ عالم تھا کہ دونوں وقت اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کر کے ہم پانچ طلبہ کو اوقاتِ مقررہ پر بھیجتیں۔ صبح کو ناشتہ نماز کے بعد ہی تیار کر دیتیں۔ مہینوں ایسا ہوا ہے کہ حضرت الاستاذ نے صبح کی نماز گورِ غریباں سے آکر درگاہ کی اکبری مسجد میں پڑھی اور ہم دونوں نے بھی پہاڑی سے اتر کر وہیں جا کر نماز ادا کی ہے۔ اس کے فوراً بعد بیضاوی یا کسی دوسری کتاب کا سبق شروع ہو گیا ہے۔ ان ایام میں ہمارے چلنے سے پہلے جبکہ کافی اندھیرا ہوتا تھا، ہمیں چائے اور ناشتہ تیار ہو کر اندر سے آجاتا تھا۔ لانے والے باقی میاں سلمہ ہوتے تھے۔ باقی میاں تنہا صاحبزادے تھے۔ ان سے پہلے دو بھائی سن شعور کو پہنچ کر عالم آخرت کو سدھار چکے تھے۔ اس پر باپ کے دربار میں طالبِ علم بیٹے کی یہ قدر تھی کہ معمولی کھدر کا لباس استعمال کراتے اور کوئی موجودہ فیشن کی چیز نہ استعمال کرنے دیتے۔ ہم بیرونی کمرے میں تین سال سے زیادہ رہے۔ اس درمیان میں کبھی بیوی صاحبہ یا صاحبزادی صاحبہ کی آواز باہر سننے میں

ہنیں آئی، حالاں کہ صرف چند گز کا مشکل سے فاصلہ تھا۔

آپ کو سن کر حیرت ہو گی کہ زمانۂ علالت و نزاعی کیفیت میں بھی رونے کی آواز نہ سنی جا سکی، بلکہ اس شہید علم و عمل کی وفات اور روانگیٔ جنازہ پر بھی جبکہ ہم تمام حلقہ بگوش اور اعزہ و احباب دامان صبر ہاتھ سے چھوڑ چکے تھے وہ پیکرِ استقامت اور جانشین رسول کی تربیت یافتہ خواتین بدستور کوہِ عزم و وقار بنی رہیں اور خدا شاہد ہے کہ گھر کے اندر بھی آوازِ گریہ کسی مرد نے نہ سنی۔ یہ تھی صحیح تعلیم اور سچی تربیت!

عزیزوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا برتاؤ رہتا۔ میرے علم میں ہے کہ بعض غریب عزیز اکثر آکر ہفتوں رہتے، کتنے ایسے بھی تھے جن کی مستقل امداد کرتے۔ تین ہمشیرگان میں سے دو بقیدِ حیات تھیں، جن میں سے ایک بیوہ اور ضرورت مند تھیں، ان کی ہر ماہ مستقل طور پر خبر گیری فرماتے۔ یہ سب سے بڑی بہن تھیں ۲۹۔ ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ مطابق یکم فروری ۱۹۳۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔

دوستوں کے ساتھ جس اخلاص سے پیش آتے اس کی نظیر

کم دیکھنے میں آتی ہے ۔ دوستی تعلقہ داروں ، نوابوں ، ساہوکاروں سے نہیں بلکہ غریب طبقہ کے افراد سے تھی ۔ حکیم سید انظار الحسن خیر آبادی عرف سید میاں ، بابو عبدالحکیم ، مستری رمضان بخش اور حاجی عبدالستار ، یہ چار مخصوص مخلصان باوفا اور محبان بے ریا تھے ۔ دوسرے تیسرے روزان کا حاضر خدمت ہونا ، دکھ درد میں شریک رہنا اور مشوروں پر عمل کرنا ان کے لیے لازمی تھا ۔ مولانا کے قائم کردہ دارالعلوم حنفیہ صوفیہ کا خوش اسلوبی سے چلانا اور اس کے لیے سرمایہ کا انتظام کرنا انھیں حضرات کے سپرد تھا ۔ انھوں نے آخر وقت تک حق رفاقت ادا کیا ۔ نزاعی کیفیت میں پلنگ کی پٹی سے جدا نہ ہوئے ۔ روح نے قفس عنصری سے انھیں کے ہاتھوں پر پرواز کی ۔ یہ تھا اخلاص و محبت اور دوستوں کا حق رفاقت (۱)!

رشتہ داروں سے بڑی محبت سے پیش آتے ۔ آپ کا دو منزلہ عالیشان آبائی مکان درگاہ کے بالکل متصل ہے ۔ اب برادر خرو شفاالملک حکیم نظام الدین کی قیام گاہ ہے ۔ مولانا چوں کہ شہر کے شور و شر کو علمی مشاغل کے لیے مضر سمجھتے تھے اور فطرتاً تنہائی

پسند واقع ہوئے تھے اس لیے کرایہ کے مکان میں شہر کی چپقلشوں سے دور پہاڑی پر سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ برادر زادہ حکیم نصیر الدین ندوی سے غیر معمولی محبت کرتے تھے اس لیے اپنا حصہء مکان ان کے نام کر دیا اور خود عمر بھر کرایہ کے مکان میں رہے۔ صرف آخری ایک سال اپنے معمولی تیار کردہ مکان میں شہر سے دو میل دور گورِ غریباں میں مع اہل و عیال گذارا۔

آپ کے دو علاتی بھائی بھی تھے۔ ان دونوں کی پرورش تعلیم و تربیت اولاد کے مثل کی۔ مولوی غازی محی الدین اجمیری عرف پیارے میاں اور محمد میاں آپ ہی کے پاس رہے۔ آخر الذکر کا انتقال مولانا کے دو سال بعد مولانا ہی کے مکان پر ہوا۔ اول الذکر خلافت کمیٹی کے سیکریٹری بننے کی وجہ سے بمبئی چلے گئے تھے اور وہاں سے آنے پر متاہل ہونے کے بعد علحدہ اقامت گزیں ہوگئے۔ اچھے مقرر اور انشا پرداز ہیں۔ اجمیر کی سیاست میں کافی ہاتھ رہتا ہے۔ درگاہ کمیٹی اجمیر کے ممبر بھی ہیں۔

اعلاء کلمۃ اللہ اور اعلان حق میں بڑے جری تھے۔ حکومتِ ہند، برادران وطن اور فساق مسلمانان سے حرمت امور

شرعیہ و ملکیہ پر مقابلے رہے - احاطہ ، درگاہ میں فاحشہ عورتوں کا گانا ہوتا، رنڈیوں کا اجتماع رہتا - مولانا نے اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا - مسلمانوں کی ایک دیندار جماعت کو ساتھ لے کر آواز اٹھائی - دنیا دار اور عیش پرست طبقہ آڑے آیا بالاخر حق کی فتح ہوئی اور جناب میر نثار احمد متولی درگاہ معلیٰ نے یہ اعلان کر دیا کہ زنانِ فاحشہ بھی نقاب کے بغیر داخل احاطہ نہیں ہو سکتیں اور ان کا گانا وغیرہ سب بند کرا دیا - میرے قیام اجمیر کے زمانے میں ایک مرتبہ عاشورہ محرم جمعہ کو پڑا - عین جمعہ کی نماز کے وقت درگاہ کے متصل بازاروں میں نقاروں اور شور و شغب کا طوفان برپا ہوا - جمعہ کی نماز کے بعد خدا کا یہ شیر کھڑا ہوا اور جامع شاہجہانی میں تحفظ ناموس اسلام پر ایسی مدلل و پرجوش تقریر کی کہ ہزارہا مسلمانوں کا یہ اجتماع عظیم زار قطار رو رہا تھا - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا بھولا ہوا سبق قوم کو یاد دلا رہے ہیں - عوام کے رجحان کے خلاف آواز اٹھانا بھی بڑا جہاد ہے -

ایک مرتبہ شب کو ایک جلسہ میں شاہجہانی مسجد میں تقریر فرما رہے تھے کہ اطلاع ملی کہ دھان منڈی سے متصل محلہ میں

مسلمان ناچ دیکھنے میں مشغول ہیں۔ کسی تقریب میں ایک مسلمان صاحب نے رنڈی کا ناچ کرایا تھا۔ تقریر سے فارغ ہو کر کچھ مسلمانوں کو لے کر چل پڑے۔ مولانا کو آتا دیکھ کر بعض مسلمان وہاں سے ٹل گئے۔ بعض اپنے مشاغل تفریح میں خلل انداز دیکھ کر آمادہ پیکار ہوئے۔ ایک بلند مقام پر پہنچ کر مولانا نے پیغام حق پہنچانا شروع کیا، اس طرح وہ مجلس رقص و سرود محفل وعظ و نصیحت سے بدل گئی۔

اس معاملہ میں مولانا کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے سامنے بھی نہیں چوکتے تھے۔ ۱۳۵۲ھ میں جب حج کے لیے روانہ ہوئے تو آپ کو اسی جہاز پر جگہ ملی جس پر ملکہ دکن سفر کر رہی تھیں۔ نگران کار کے طور پر خطاب یافتہ ایک بڑے عہدیدارِ ریاست ان کے ہمرکاب تھے۔ ایک مجلس میں کسی نے مولانا کا تعارف نواب صاحب سے کرایا۔ مولانا کے علم و فضل اور بلند شخصیت کا اظہار کرنے پر بھی نواب صاحب نے کوئی خاص اہمیت نہ دی لیکن جب مولانا کا اجمیری ہونا معلوم ہوا تو بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ دست بوسی کی۔ مولانا کو جلال آ ہی تو گیا۔ ارشاد ہوا، ہم نے ۱۴

برس حصول علم، قرآن وحدیث میں آنکھیں پھوڑیں، اللہ و رسول کا علم دین حاصل کیا، لیکن یہ علم کسی عظمت کا مستحق نہ ٹھیرا، صرف اجمیری ہونا سب سے بڑی کرامت ہو گئی۔ اجمیر میں تو کافر و فاسق، کلب و خنزیر سبھی بستے ہیں۔ اگر صرف اجمیری ہونا عزت کی نشانی ہے تو بددین و کافر، کتا اور سور سبھی قابل تعظیم ہوئے۔ نواب صاحب بڑے خجل و شرمسار ہوئے۔

ایک دوسری مجلس میں یہی نواب صاحب پرانے نظام تعلیم پر تبصرہ فرمارہے تھے، اس کی فرسودگی پر دلائل پیش کر رہے تھے۔ مولانا سے نہ رہا گیا، فرمایا کیا کریں ہم تو اسی نظام تعلیم پر مجبور ہیں، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر تمام پرانی چیزیں بدلوا دیں نماز، روزہ، حج اور زکوۃ سب پرانی چیزیں ہو چکیں۔ جب تک یہ جاری رہیں گی، ہدایہ، شرح وقایہ اور قدوری وغیرہ کا درس بھی جاری رہے گا۔ آپ ان سب چیزوں کو بدل دیں، ہم نیا نظام تعلیم خود بخود بنالیں گے، اسی طرح وہ نواب صاحب خاموش ہوئے۔

مولانا کا سیاسی مسلک تحریکِ خلافت سے لے کر آخر وقت تک ایک ہی رہا، غیر ملکی حکومت کا خاتمہ اور استخلاص وطن کی

جد و جہد میں تمام اقوام ہندوستان سے اشتراکِ عمل، مجلس احرار اسلام، جمعیۃ العلمائے ہند، آل انڈیا خلافت کمیٹی، انڈین نیشنل کانگریس، ہر آزادی پسند جماعت کے رکن رکین تھے۔ صوبائی اور مرکزی صدر و ڈکٹیٹر رہے۔ آخر عمر میں جب کہ ۲۰- مارچ ۳۸ء مطابق ۱۷- محرم ۵۷ھ کو وجع الورک میں مبتلا ہو کر پاؤں سے معذور بھی ہو چکے تھے اور اس معذوری کے باوجود سیاسی سرگرمیاں حسبِ دستور جاری بھی تھیں، حریفان حرص و آزا اور خواہش مندان اقتدار نے آخری حربہ استعمال کیا۔ ایک دہلوی مرزا جو منافقت کی مکمل تصویر تھا، بظاہر مولانا کی شاگردی اور عقیدت مندی کا مدعی، لیکن یہ باطن مولانا کو اپنے منصوبوں کی تکمیل میں سب سے بڑا سنگ گراں سمجھتا تھا۔ ایک طرف حکومت سے ساز باز اور دوسری طرف مسلمانوں کا سیاسی "وکیل" بنے رہنے کی کوشش کرتا رہتا۔ بعض اہل غرض افراد کو شریکِ سازش بنا کر حکومتِ نظام سے مراسلت کا سلسلہ شروع کیا کہ حضورِ نظام جس دارالعلوم (معینیہ عثمانیہ اجمیر) کے کفیل ہوں اس کا صدر المدرسین "یارِ وفادار" کے حلیف کی بیخ کنی میں مصروف

رہے ۔ تحقیقاتی وفد رجب ۵۷ھ میں اجمیر پہنچا ۔

اس وفد نے مولانا سے عقیدت مندانہ انداز میں ریاست کی مجبوریاں ظاہر کرتے ہوئے سیاست سے کنارہ کشی اور علمی خدمات ہی میں توجہات کے انحصار کی التجا کی ۔ مولانا نے بات کی تہہ تک پہنچ کر فرمایا، جہاں تک علمی خدمات کا تعلق ہے ، حصول علم کے بعد سے کوئی دور ایسا نہیں گذرا کہ اس سے غفلت برتی گئی ہو ۔ تحریکِ خلافت کی دو سالہ قید میں جیل خانہ کی چار دیواری میں بھی دوسرے فنون کے ساتھ دورہ حدیث بھی ہوتا رہتا تھا (مولانا کے ساتھ بعض تلامذہ بھی شریک سجن ہو گئے تھے ۔ جو اصول مقصدِ زندگی بن چکا ہو اسے اس حیاتِ مستعار میں کیوں کر چھوڑا جا سکتا ہے)۔ وفد واپس چلا گیا ، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۲۔ مارچ ۳۹ء مطابق ۲۰۔ محرم ۱۳۵۸ھ کو بحکم دولتِ نظام مولانا کو مدرسہ کی خدمات سے سبکدوش کرنے کی اطلاع متولی درگاہ معلیٰ اور معتمد مدرسہ میر نثار احمد صاحب مرحوم کے پاس آگئی ۔ مولانا کی زندگی کا یہ آخری سال تھا ۔ پورا سال بھی نہ گذرنے پایا تھا کہ دس روز قبل ہی ۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ کو سفر آخرت اختیار فرمایا ۔ یہ آخری سال

مولانا کا بڑی عسرت کے ساتھ گذرا۔ پاؤں سے معذور اور مسلسل علالت کے ساتھ یہ مالی پریشانی ناقابل برداشت تھی۔

حق و صداقت اور اصول پروری کی پاداش میں یہ صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں اور یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وفات کے وقت کل "خزانہء عامرہ" سولہ روپیہ کچھ آنہ خاص صندوقچہ سے نکلا تھا۔

سبکدوشی کے بعد دارالعلوم کی جانب سے قاعدہ کے مطابق غالباً بارہ سو روپیہ ملا تھا۔ ہم سب کے اصرار اور حاجی عبدالستار کے اہتمام سے گور غریباں کی افتادہ زمین پر مختصر مکان تعمیر ہوا جس کا نام مولانا نے "زاویہ" رکھا۔ دنیاوی جائداد میں اولاد کے لیے صرف یہی ترکہء پدری تھا۔

کتابوں سے عشق تھا۔ بہترین الماریاں اور درازیں بنواتے اور ترتیب سے کتابیں رکھتے۔ مضمون کے علاوہ کتاب کی عمدہ کتابت و طباعت بھی پسند آنے کے لیے کافی تھی۔ کتاب پسند آنے پر ہر ممکن قیمت پر خرید فرماتے۔ مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی کے پاس استنبولی طباعت کی دسوقی شرح مختصر معانی تھی جس کے

حاشیہ پر مختصر اور حوض میں شرح تھی۔ مولانا کے پاس جو دسوقی تھی۔ اس میں کئی کتابیں تھیں۔ مولانا کی خواہش تھی کہ ایسی دسوقی مل جائے جس کے ساتھ اور کتابیں نہ ہوں۔ مولوی نجم الحسن نے اپنی کتاب دکھلائی تو پھڑک گئے۔ فرمایا کہیں ایسی دسوقی مل جائے تو مجھے ضرور منگا دو۔ شاگرد تھے، مزاج شناس، کہنے لگے اگر حضرت اپنے مجموعہ شروح تلخیص کے ساتھ مصفی شرح موطا عنایت فرمائیں تو کتاب حاضر ہے۔ فوراً معاملہ ہو گیا۔ خود راقم السطور کی مسلم شریف کے عوض جو سبز کاغذ پر عمدہ چھپی ہوئی تھی اپنی مسلم شریف اور الف لیلہ (عربی) کی دونوں جلدیں عنایت فرمائیں۔ بعد میں کس وجہ سے اقالہ فرمالیا تھا۔

۲۷۔ جنوری ۱۹۳۹ء کو جامع مسجد جے پور کے دروازے کی توسیع کے سلسلے میں جب گولی چلی اور بیسیوں مسلمان خاک و خون میں لتھڑ کر شہید ہوئے اور وہاں کے مسلمانوں نے جے پور سے ہجرت کی ٹھانی تو حضرت الاستاذ ۲۷۔ مارچ ۱۹۳۹ء کو معذوری کے باوجود افہام و تفہیم کے لیے دوسری بار جے پور تشریف لے گئے ہم دونوں بھی ہمرکاب تھے۔ عبدالرحمن شورگر کے مکان میں قیام

ہوا کہ یہی امیر جماعت مہاجرین تجویز ہوئے تھے۔ عبدالرحمن مذکور کے پاس کعبۂ معظمہ کا ایک نقشہ تھا، جس میں ایک ایک چیز وہاں کی دکھلائی گئی تھی۔ دوران قیام میں میزبان نے وہ سب سامان باقاعدہ مرتب کر کے دکھایا اور اس کے ساتھ حدیقہ حکیم سنائی کا ایک قلمی نسخہ دکھلایا، جو ایران کے کسی خوشنویس کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ دریافت کرنے پر ایک ہزار قیمت بتائی گئی۔ مولانا دیکھ کر پھڑک اٹھے تھے۔ اجمیر پہنچنے پر کئی بار فرمایا کہ اگر ہزار روپے ہوتے تو ابھی خرید لیتا۔ اور شوق کے بے پناہ جذبہ کے ماتحت مولوی محمد اللہ خطیب جامع مسجد جے پور و معتقد خاص کو خط لکھ کر دیا کہ کسی صورت سے وہ نسخہ حاصل کرو، لیکن ایک ہزار سے کم پر عبدالرحمن رضامند نہ ہوئے۔

ایک بار جے پور کا کتب خانہ دیکھنے تشریف لے گئے۔ اسفارِ اربعہ کی چار جلدیں مطالعہ کے لیے باضابطہ لائبریری سے حاصل کیں اور ان کو لے کر اجمیر آ گئے۔ سیکریٹری لائبریری نے تار دیا کہ یا تو کتاب بھیجیے، ورنہ دو سو روپیہ وصول کیا جائے گا۔ مولانا نے فوراً ہی تار کے ذریعہ رقم مطلوبہ روانہ کر دی اور کتاب پر قبضہ کر لیا۔

فرماتے تھے کہ اگر پانچ سو طلب کرتے تو بھیجتا۔

قرآن شریف عمدہ کاغذ اور بہتر کتابت و طباعت کے ہدیہ کرتے۔ اس قسم کے تمام قرآن پاک زینتِ کتب خانہ تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میرے کتاب خانہ سے اگر ایک کتاب بھی چلی جائے چاہے وہ کتنی ہی معمولی ہو، تو میں سمجھوں گا کہ سارا کتب خانہ چلا گیا ہر سال کتابوں کو دھوپ دلواتے اور باقاعدہ جائزہ لیتے۔ کتابیں سب موجود ہوتیں تو شیرینی وغیرہ سے متعلقہ طلبہ کو نوازتے۔

اصطرلاب سے متعلق بست باب کی شرح برجندی قلمی مولانا کے کتاب خانہ میں تھی۔ میں نے اس کی نقل کی اجازت چاہی جو خوشی سے مل گئی۔ میں نے نقل شروع کی ہی تھی کہ رمضان کا مبارک مہینہ آگیا۔ اسی مہینے ہم لوگوں کو اپنے وطن جانے کی اجازت مل جاتی تھی۔ جب میں چلنے لگا تو برجندی کے متعلق دریافت کیا (عرض کیا) کہ رمضان کے اوقات فرصت میں خوب نقل کر لوں گا۔ التجا منظور نہ ہوئی۔ بار بار اصرار پر بھی نفی میں جواب ملا۔ میں نے عرض کیا آپ مجھ پر اطمینان نہیں کرتے۔ فرمایا تم پر بیٹے سے زیادہ بھروسہ ہے لیکن تمہاری زندگی پر

بھروسہ نہیں ۔ خدا نخواستہ تمہارا انتقال ہو جائے تو تمہارے وارثوں سے کون لڑے گا۔ ہاں اگر اپنی زندگی کا اطمینان دلا دو تو کتاب کا اطمینان بھی کر لوں گا۔

کتابوں کی طباعت و کتابت کی طرح عمدہ جلدوں سے بھی شغف تھا ۔ کلکتہ کی بندھی ہوئی جلدوں کا بہت شوق تھا ۔ علی العموم دہلی جلد بندھوایا کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ جلد کی خوبصورتی کا ذکر ہو رہا تھا ۔ مولوی محمد عباس بہاری نے دو جلدیں کلکتہ کی بندھی ہوئی دکھلائیں ۔ دیکھتے ہی گرویدہ ہو گئے ۔ فرمایا، افسوس میرے کتب خانہ میں ایک جلد بھی ایسی نہیں ہے ۔

انتقال سے تین چار ماہ پیشتر بمبئی اور سورت سے کتابیں منگوائیں، اس کے بعد کلکتہ جلد بندھنے کے لیے بھیجیں جس کا بے چینی سے انتظار رہتا ۔ روزانہ مولوی نجم الحسن کو اسٹیشن پر پتہ لگانے کے لیے بھیجتے ۔ خدا خدا کر کے پارسل آیا ۔ جلدیں واقعۃ قابل دید تھیں ۔ الماری میں اپنے سامنے ترتیب سے رکھوائیں پھر فرمایا، اب دیکھو میرا کتب خانہ کیسا معلوم ہوتا ہے ۔ مولوی نجم الحسن نے تعریفوں کے پل باندھ دیئے تو بہت خوش ہوئے ۔ میں

سے نے بھی شرح جامی اور فرائد کی جلدیں ساتھ ہی بند ھوا گر منگوائیں اور مولوی محمد عباس بہاری کی وہ دونوں کتابیں بھی خرید لیں جن کی جلدیں مولانا کو دکھائی گئی تھیں ۔ یہ کتابیں حاشیہ عبدالغفور اور اس کا ضمیمہ تھیں ۔ افسوس مولانا ان خوشنما جلدوں سے زیادہ عرصہ تک محظوظ نہ ہو سکے اور نہ ان مجلد کتابوں کے مطالعہ کا موقعہ ہی ملا، کیونکہ ایک ماہ بعد دنیاے فانی سے عالم جاودانی کو تشریف لے گئے۔

احادیث میں کنزالعمال اور لغت حدیث میں مجمع البحار بہت پسند فرماتے تھے ۔ تفسیرات احمدیہ، رسائل الارکان الاربعہ، آبِ حیات اور حاشیہ قاضی علامہ فضل حق خیرآبادی اکثرو بیشتر مطالعہ میں رکھتے ۔ آخرالذکر کے متعلق فرماتے تھے کہ حاشیہ فضل حق کا میں نے برسوں سفرو حضر میں اس طرح مطالعہ کیا ہے جس طرح کوئی قصہ کہانی کی کتاب پڑھتا ہے ۔ نصب الرایہ فے تخریج احادیث الہدایہ کا بہت اشتیاق تھا۔ فرماتے کہ مدینہ منورہ میں مولانا عبدالباقی فرنگی محلی لکھنوی مہاجر مدنی مرحوم نے مجھ سے فرمائش کی تھی ۔ موصوف کی ٹھوس قابلیت اور کمال علمی کے

مولانا معترف تھے ۔ فرماتے تھے کہ حکیم صاحب (مولانا برکات احمد ٹونکی بہاری) بھی ان کی تعریف کیا کرتے تھے ۔ ایک روز مولوی نجم الحسن نے نصب الرایہ کے زیرِ طبع ہونے کی خوش خبری سنائی تو بہت مسرور ہوئے ۔

فقہاء کے بہت مداح تھے ۔ ہدایہ جلد ثالث خاص ذوق اور توجہ سے پڑھاتے تھے ۔ امام صاحب کی دلیل بیان فرماتے وقت چہرہ جوش سے سرخ ہو جاتا تھا ۔ فرماتے تھے کہ ایسا شخص کوئی دوسرا پیدا ہی نہیں ہوا ۔ عام طور پر فقہا کی نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی کے بہت مداح تھے ۔ فقہا کے خلاف اگر کسی کی زبان یا تحریر سے کوئی بات آپ کے علم میں آتی تو سخت برہم ہوتے تھے ۔

ہدایہ جلد ثالث ، ترمذی شریف ، قاضی مبارک ، شرح چغمینی اور بیضاوی شریف بڑی دلچسپی سے پڑھاتے تھے ۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بڑی کتابیں پڑھانے والے اساتذہ ابتدائی کتابوں میں وہ ذوق اور مہارت نہیں رکھتے جو بالائی کتابوں میں ہوتی ہے ، لیکن مولانا کو یکساں کمال تھا ۔ فرزندِ سعید مولوی عبدالباقی سلمہ کو سمجھانے اور یاد کرانے کے لیے مرقات اور سکندر نامہ کی سماعت

پر مولوی نجم الحسن کو مامور فرما دیا تھا۔ موصوف کا بیان ہے کہ اس خوبصورتی اور سہولت سے سمجھاتے تھے کہ بہ آسانی ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ لطف یہ ہے کہ فارسی میں بھی پورا پورا تبحر تھا۔ چناں چہ سکندر نامہ میں اکثر مولوی نجم الحسن سوالات بھی کرتے رہتے تھے۔ برادر عزیز محمد زاہد خاں سلمہ کو میری استدعا پر انوار سہیلی شروع کرا دی تھی۔

جب موجودہ نظام حیدر آباد سلطان العلوم میر عثمان علی خاں بالقابہ اجمیر شریف حاضر ہوئے اور مدرسہ معین الحق (قائم کردہ مولانا) میں اپنے استاذ نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں صدر امورِ شرعیہ دکن کے ہمراہ پہنچے تو مولانا کی درس گاہ میں جاری سبق کو دلچسپی سے سنا اور نور الانوار (اصول فقہ کی اوسط کتاب مصنفہ ملا احمد جیون رحمۃ اللہ علیہ استاذِ عالمگیر بادشاہ) کے درس کی فرمائش کی۔

مولانا نے اس کے سبق کی ایسے مدلل طریقہ پر تقریر کی کہ نظام صاحب کو وجد آگیا۔ دوران قیام میں چھ مرتبہ شریک درس ہوئے اور فرمائشی اسباق کی سماعت کی۔ خلعت شاہانہ اور ایک

ہزار روپیہ سے نوازا - اور مدرسہ معین الحق کو دارالعلوم معینیہ عثمانیہ میں تبدیل کر کے ایک ہزار سے زیادہ مشاہرہ مقرر فرمایا جو اب تک بدستور جاری ہے -

مولانا نقلی و عقلی مسائل میں اپنی مستقل رائے رکھتے تھے اور کافی تلاش و جستجو اور تحقیق و تدقیق کے بعد نتائج پر پہنچے تھے - مختلف فیہ مسائل کو چھوڑ کر باقی مسائل میں امام ابن تیمیہ کے فضل و کمال کے مداح تھے - حدیث " لاتشدالرحال " وغیرہ پڑھاتے وقت ان کے مسلک کارد بلیغ فرماتے، کلام پاک کی آیات کے سلسلے میں فرمایا کرتے تھے کہ ہر آیت علحدہ علحدہ ہے، لہذا ربط پیدا کرنے کی کوشش بے سود ہے -

سورۃ یوسف کی آیت فلمار أینہ اکبر نہ و قطعن ایدیھن و قلن حاش للہ ماھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم میں عام اہل تفسیر کی رائے سے اختلاف تھا - فرماتے تھے کہ زنان مصر کی یہ کیفیت حسن یوسف کی بنا پر ہنیں بلکہ ان کی عظمت و جلالت و عفت کی بنا پر ہوئی تھی ورنہ "ملک کریم" کہنے کی کوئی وجہ ہنیں تھی - اس باب میں بخاری شریف کی کتاب التفسیر سے بھی

استشہاد فرماتے تھے اور یوں بھی بہترین تفسیر بخاری کی کتاب التفسیرہی کو سمجھتے تھے۔

حوض کے بارے میں دہ در دہ کو ضروری نہ سمجھتے تھے۔ احادیث اور سرزمین عرب میں پانی کی قلت سے دلائل پیش کرتے تھے۔ فرماتے تھے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کسی مسجد میں بیٹھے تھے۔ ماء کثیر سے متعلق سوالات کئے جارہے تھے۔ آپ نے اس مسجد کے حوض کی طرف اشارہ کر دیا بعد میں جب اس کی پیمائش کی گئی تو اتفاق سے دہ در دہ نکلا۔ لوگوں نے اسی کو دلیل بنالیا۔

جمعہ صحیح ہونے کے لیے فقہا حنفیہ نے مصر کی شرط لگائی ہے پھر مصر کی تعریف میں فقہا کے مختلف اقوال ہیں۔ مولانا نے ملا نظام الدین استاذ الکل کا مسلک اختیار فرمایا تھا، جو رسائل الارکان الاربعہ میں مولانا عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محلی سے منقول ہے کہ مصر وہ ہے جہاں انسانی ضروریات میسر آسکیں۔

ما اھل بہ لغیر اللہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے حرمت کے دائرہ میں ان جانوروں کو بھی داخل کر لیا ہے جو کسی بزرگ کے فاتحہ وغیرہ کے نام سے موسوم و متعین ہو جائیں۔

مولانا کا مسلک شاہ صاحب کے مخالف تھا، اس پر ایک بسوط محققانہ مضمون بھی لکھا تھا جو ضائع ہوگیا اور روز افزوں صحت کی خرابی نے دوبارہ لکھنے کا موقعہ نہ دیا۔

مسئلہ تشکیک میں جہاں مولانا عبدالحق خیرآبادی نے شرح مرقات میں وجود واجب میں تشکیک باعتبار شدت و ضعف مانتے ہوئے ایک توجیہ کی ہے۔ مولانا نے اپنے استاذ الاستاذ سے اختلاف کیا ہے اور مودبانہ الفاظ میں ایک مضمون کا املا کراتے ہوئے تحریر کرایا تھا کہ یہ اعلیٰ توجیہ فقیر کے ذہن اسفل سے بعید ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے کہ جب ۳۵ء کے آخر میں مولانا کے کار نبیکل (اریٹھ پھوڑا) نکلا تھا اور گردن میں چھ انچ گہرا شگاف دیا گیا تھا تو بلا کسی بے ہوشی کی دوا کے اتنا بڑا آپریشن کرانے پر اس لیے کمر ہمت باندھ لی تھی کہ مسئلہ مذکورہ بالا میں فاضل خیرآبادی سے عالم تصور میں مناظرہ شروع کر دیا تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ اسی استغراق میں تمام منزلیں طے ہو گئیں۔

تعلیم و تدریس اور تصنیف و مطالعہ سے آخر وقت تک پوری دلچسپی رہی۔ بخاری شریف کے پاروں کے شرحی نوٹ تاج

کمپنی لاہور کی فرمائش پر اردو میں تحریر فرمانا منظور کر لیے تھے۔ اور ایسی حالت میں پہلے پارے کے حاشیہ پر نوٹ تحریر فرمائے جبکہ بیٹھنے کی جگہ پھوڑا نکلا ہوا تھا۔ برادر خورد حکیم نظام الدین اجمیری کے مکان پر علاج کی غرض سے قیام تھا۔ چلنے پھرنے سے معذور ہو ہی چکے تھے۔ بعض مقامات کی شرح اپنے ہاتھ سے لکھی اور اکثر مولوی سید نجم الحسن سے املا کرایا۔ اس میں مولانا کو دلچسپی یوں بھی بڑھ گئی تھی کہ غیر مقلد مولوی وحید الزمان حیدر آبادی کے اس قسم کے شرح نوٹوں کے ساتھ بخاری شریف شائع ہو چکی تھی جس میں امام اعظم اور دوسری ائمہ ثلاثہ کے مسالک پر جا بجا چوٹیں بھی تھیں۔ بلند بانگ دعوں کے باوجود جب اسے تاج کمپنی نے تجارتی مصلحتوں کی بنا پر طبع نہ کرایا تو بہت برہم ہوئے۔

جناب میر نثار احمد مرحوم متول درگاہ معلی و معتمد دارالعلوم معینیہ عثمانیہ اجمیر اور دوسرے بعض مخلصین کی فرمائش پر مولانا نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح حالات مرتب کرنا شروع کیے تھے۔ اس کی تکمیل بھی اسی زمانہ، علالت میں فرمائی جو انتقال کے ایک سال بعد نثار

خواجہ" کے نام سے شائع ہوئی اور پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا میر نثار احمد کے نام کی رعایت سے "نثار خواجہ" نام تجویز فرمایا۔ مولانا محمد یونس میرٹھی ناظم دارالعلوم معینیہ عثمانیہ و خطیب جامع شاہجہانی درگاہ معلیٰ نے کتاب کے آخر میں مولانا اور کتاب سے متعلق جو صفحات لکھے ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں اپنی مہربانی سے میرا اور مولوی سید نجم الحسن کا ذکر بھی کیا ہے کہ ہم دونوں نے استاذ مکرم کا حق رفاقت آخر تک کس طرح ادا کیا اور مولانا نے کس کس طرح نوازا۔

اسی زمانہ علالت میں ترمذی شریف کی شرح لکھنا شروع کی۔ جب ایک جزو ہو جاتا تو ہم دونوں بھی نقل کر لیتے۔ ابواب الطہارۃ بھی ختم نہ ہونے پائے تھے کہ زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا بہر حال جتنا کچھ ہو گیا ہے وہ بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے کچھ کم نہیں ہے۔ مولانا کی وسعتِ نظر اور مہارتِ علوم نقلیہ کا اس سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ اصل مسودہ مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا موصوف کے کتاب خانہ میں مولوی عبدالباقی سلمہ کے پاس محفوظ ہے۔ اس پر جا بجا حاشیہ مولانا نے میرے نام (الشاہد الشروانی)

سے پڑھایا ہے۔

مولانا معضلاتِ فن کی تشریحات بھی فرماتے رہتے تھے۔ خاص خاص مسائل پر بسوط مضمون بھی تحریر فرمادیتے تھے چناں چہ علم و معلوم، دہرا اور وجود پر بسوط مضامین خود مولانا کے دستِ مبارک کے لکھے ہوئے میرے پاس موجود ہیں۔ آخری مضمون شوال ۵۵ھ میں ختم کیا تھا۔ زمانہء علالت و معذوری میں بھی بعد عصر یہ سلسلہ جاری رہتا۔ چناں چہ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۸ھ سے لے کر ۱۵۔ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۷۔ دسمبر ۱۹۳۹ء وفات سے ایک ماہ پچیس روز قبل تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ وجود رابطی، متعلق تصدیق، حقیقتِ تصدیق، تحقیق اجزاء قضیہ و تصدیق، مقولات عشر، کلی طبعی وغیرہ جیسے معرکتہ الاراء فنی مسائل کی املا کرائی۔ ۶۔ نومبر ۱۹۳۹ء رمضان المبارک ۱۳۵۸ھ دوشنبہ کو بخاری شریف اور ۲۸۔ نومبر ۱۹۳۹ء مطابق ۱۶۔ شوال ۵۸ھ منگل کو سنن ابی داؤد ختم ہوئی، اس کے بعد ۲۹۔ نومبر ۱۹۳۹ء مطابق ۱۷۔ شوال ۵۸ھ کو مسلم شریف کرادی گئی۔ کچھ اسباق ہو پائے تھے کہ میں تخت بیمار پڑ گیا اور تقریباً دو ماہ اس کا چکر رہا۔ وہاں سے ۱۵۔ ذی الحجہ ۵۸ھ

مطابق ۲۶- جنوری ۱۹۴۰ء کو واپس اجمیر پہنچا- اپنی بد نصیبی پر جتنا بھی ماتم کروں کم ہے کہ ان آخری ایام میں خدمت و استفاضہ سے محروم رہا- واپسی پر پھر مسلم شریف کے اسباق شروع ہوئے-

اس زمانہ علالت اور آخری ایام حیات میں، میں اور مولوی سید نجم الحسن ہم دونوں ہی خدمت گذاری اور استفادہ کے لیے مخصوص ہو گئے تھے- ۸- فروری ۱۹۴۰ء مطابق ۲۸- ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ پنجشنبہ تک اسباق و استفادہ کا سلسلہ رہا- یکم محرم الحرام ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۰- فروری ۱۹۴۰ء شنبہ کو مرض نے شدت اختیار کرلی- صحیح بخاری اور آیہء کریمہ کا ختم کیا گیا، بکری ذبح کی گئی، شام کو کچھ افاقہ ہوا، تیسرے روز حالت کچھ اور سنبھل گئی- ۸- محرم الحرام کو حالت مایوس کن ہو گئی، دوسرے دن اطبا بھی ناامید ہو گئے- آخر تیسرے روز ۱۰- محرم الحرام ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹- فروری ۱۹۴۰ء یکشنبہ کو ٹھیک شہید کربلا سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت اسی یوم عاشورہ میں یہ آفتاب علم و عمل اور مہتاب رشد و ہدایت ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا، انا للہ و انا الیہ راجعون O

گویا نزاعی حالت سے دس روز پہلے تک درس حدیث جاری رہا۔ منطق و فلسفہ جو خاص فن تھا اس کا سلسلہ دو ماہ قبل ہی منقطع ہو چکا تھا۔ جب بیماری نے نازک صورت اختیار کی اور موصوف کو مایوسی ہوئی تو فرمایا:

افوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعبادہ

جب تک زبان نے کام دیا اور اپنی حالت کو دیکھ دیکھ کر اس آیت کا تکرار فرماتے تھے اور سورۃ یٰس تسکین خاطر کے لیے پڑھوا کر سنتے تھے۔ صحابہء کرام میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر جان فدا کرتے تھے۔ ان کے ایمان و ایقان کی نظیر نہیں بتاتے تھے فرماتے تھے انھوں نے خدا کو پہچان کر محمد صلی اللہ وسلم کو پہچانا نہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر خدا کو جانا۔

حضرات اہل بیت کے ساتھ خاص انس اور لگاؤ تھا۔ بخاری شریف میں حضورِ اکرم علیہ الصلوۃ والسلام کی وفات کے سلسلے میں حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کا جب یہ قول پڑھاتے کہ اے انس! تمہارے دلوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر مٹی ڈالنا کیسے گوارا کر لیا تو بے ساختہ ایک چیخ نکل جاتی اور

ایک عرصہ کے لیے رلودگی سی پیدا ہو جاتی ۔ جب بھی حدیث شریف میں یہ موقعہ آیا ہے یہی کیفیت ہوئی ۔ ایک بار زمانہء علالت میں دوران گفتگو میں یہ واقعہ زبان پر آگیا، چیخ نکلی، حالت متغیر ہو گئی، بدن پر رعشہ طاری ہو گیا۔

خیرآبادی خاندان علم میں اس جامعیت کا کوئی دوسرا فرد نہیں گزرا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، منطق، فلسفہ، ریاضی اصطرلاب، ادب وغیرہ جملہ فنون پر یکساں عبور تھا۔ خدا شاہد ہے اپنا تجربہ یہ ہے کہ ہر فن اس طور سے پڑھاتے تھے کہ امام فن معلوم ہوتے تھے اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس فن کے سوا انہیں دوسرا فن آتا ہی نہ ہوگا۔

ریاضی میں مولانا حکیم برکات احمد بہاری ثم ٹونکی زیادہ درک نہ رکھتے تھے، اس لیے علی گڑھ آکر استاذ العلماء مولانا مفتی محمد لطف اللہ پلکھنوی کی چھ ماہ تک جوتیاں سیدھی کرکے اس فن پر کماحقہ عبور حاصل کیا تھا۔

ایک بار مولوی حکیم ظفر الحق نبیرہ شمس العلما مولانا عبدالحق خیرآبادی سے کسی بات پر ٹونک میں خفا ہوئے تو فرمایا کہ :

"میاں تم ننگِ خاندان ہو اور میں فخرِ خاندان، تمہارے خاندان علم و فضل میں کوئی تم سا نہیں ہوا اور میرے خاندان میں آج تک مجھ جیسا نہیں گزار۔"

استاد کے استاد زادہ سے یہ سخت کلامی اس وجہ سے ہو گئی تھی کہ موصوف ان کو تکرارِ اسباق بھی کراتے تھے اور استاد کے حکم کے مطابق پوری توجہ اور خیال رکھتے تھے۔

پسماندگان میں ایک بیوہ، ایک صاحبزادی جن کی ۱۵۔ ربیع الاول ۱۳۶۳ھ کو شادی ہو چکی ہے اور ایک صاحبزادے مولوی عبدالباقی سلمہ ہیں جن کا نکاح شوال ۱۳۶۵ھ میں ہوا ہے اور بھیتم ہائی اسکول کیکڑی میں ٹیچر ہیں۔ افسوس کہ حالات کے سازگار نہ رہنے سے اوسط درجہ تک عربی تعلیم حاصل کر کے "عالم" کے امتحان دینے پر اکتفا کیا۔ اب انٹرنس کا امتحان دے رہے ہیں۔ سرکار نظام نے مولانا کی علمی خدمات کی بنا پر وفات کے بعد سے پچاس روپے مشاہرہ پسماندگان کے لیے مقرر کر دیا ہے جو برابر جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے استقامت بخشے۔

تصانیف میں (۱) ازالۃ اوہام الغفول، (۲) آزاحۃ شبہات

الشادی، (۳) چہار تازیانہ قہار، (۴) حیوۃ طیبہ، (۵) چہل حدیث، (٦) نثارِ خواجہ، (۷) القولِ الاظہر، (۸) تجلیات انوارالمعین، (۹) اسعاف اور (۱۰) کلمۃ الحق مطبوعہ ہیں۔

استاذ الاساتذہ مولانا فضل حق رام پوری پرنسپل مدرسہ عالیہ رام پور نے شمس العلما مولانا عبدالحق خیرآبادی کے حاشیہ شرح مواقف پر بعض شبہات و اعتراضات کیے تھے۔ اول الذکر دونوں کتابیں اسی جواب و جواب الجواب کا درجہ رکھتی ہیں۔ ضمناً فنی و تحقیقی مسائل پر شرح و بسط سے روشنی پڑ گئی ہے، دونوں عربی میں ہیں۔ چہار تازیانہ قہار مختصر روداد ہے۔ اس مناظرہ کی جو مولانا کے استاد مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی اور مولوی عبدالوہاب بہاری کے درمیان دربار رام پور میں ہوا تھا، اس میں بھی بعض فنی مسائل مذکور ہیں۔ حیوۃ طیبہ نواب عبدالواجد علی خاں رئیس بوڑھانسی ضلع بلند شہر و جاگیردار جے پور کی سوانح حیات ہے۔ فقہی اور شرعی مسائل سے مملو ہے۔ نواب صاحب موصوف نے تحریکِ خلافت میں علم و علماء اور مجاہدین زعما کی خدمت اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔ مولانا جیل میں تھے کہ یہ دیندار بزرگ دنیا سے

اٹھ گیا۔ مولانا سے بڑا خلوص و اعتقاد رکھتے تھے۔ اسی بنا پر ترتیب سوانح حیات سے زندہ جاوید بنا دیا۔

جناب مولانا احمد رضا خاں بریلوی مرحوم جمعہ کی اذان ثانی کو مسجد سے باہر ضروری سمجھتے تھے۔ ممبر کے سامنے اذان کو غیر مشروع مانتے تھے۔ القول الاظہر اور تجلیاتِ انوار المعین اسی کا جواب اور جواب الجواب ہیں۔ ضمناً دوسرے فقہی مسائل بھی آ گئے ہیں۔

جناب مولانا احمد رضا خاں بریلوی مرحوم اور جناب مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم میں خیالات و عقائد کے لحاظ سے بعد المشرقین تھا مگر جہادِ حریت کے خلاف تحریکِ خلافت کے دور میں دونوں بزرگ متفق ہو گئے تھے۔ کلمہء حق میں مولانا نے اسی پر تبصرہ فرمایا ہے۔ باقی تصنیفات کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔

عربی میں دو رسالے، رسالہ فی بیان العمرۃ اور رسالہ مسائل الحج والعمرہ بھی لکھے جو غیر مطبوعہ ہیں۔ قاضی کے بعض مقاماتِ ابتدا کا حل بھی اردو میں کر دیا ہے۔

مولانا نے قمری حساب سے ۶۰ سال کی عمر پائی۔ اس میں

۴۰ سال مسلسل درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا، ہزاروں طلبہ مستفید ہوئے، بہت سے تلامذہ سے اب بھی دریائے فیض جاری ہے۔ مولوی منتخب الحق بہاری مدرسہ خلیلیہ ٹونک میں، مولوی عبید اللہ جامعہ عباسیہ بہاول پور میں، مفتی محمود حسن دارالعلوم راندیر میں، مولوی سید نجم الحسن درگاہ مخدومیہ خیرآباد میں طلبہ کو فیض پہنچارہے ہیں۔ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں بھی مولانا کے ایک شاگرد درس دے رہے ہیں۔ صاحبزادہ قمر الدین سجادہ نشین سیال شریف (پنجاب)، صاحبزادہ ہاشم جان سندھی، مولوی طاہر حسین امام عیدگاہ دہلی، مولوی غازی محی الدین اجمیری، مولانا نور الدین خلف مولانا قمر الدین اجمیریؒ، مولوی عبدالشکور بہاری، مولوی عبدالحی اجمیری، مولوی افتخار احمد چھپروی بہاری، حضرت مخدوم الانام شاہ مقبول میاں قلندر خیرآبادی اور حکیم نصیر الدین ندوی وغیرہ قابل ذکر تلامذہ ہیں۔

مولانا حافظ مفتی سلطان حسن اکبرآبادی اور مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی استفادہ کیا ہے۔

مولانا ہزار اصرار پر بھی کسی کو بیعت نہ فرماتے تھے۔

مولانا احمد علی ناظم انجمن خدام الدین لاہور نے خطوط کے ذریعہ اصرار کی انتہا کر دی، خود بھی حاضر ہوئے، سینکڑوں التجاؤں کے بعد شرفِ پذیرائی بخشا گیا۔ اسی طرح سیٹھ عبدالمجید احمد آباد (تالے والے) ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے تو مجبور ہو کر ان کو بیعت کرنا پڑا۔ ان دو حضرات کے سوا کسی اور کو بیعت کرنا میرے علم میں نہیں ہے۔ بیعت مصافحہ و ضیافت کے لیے اذنِ عام تھا۔ اکثر حضرات کو اجازت بھی بخشی گئی۔ ۵۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء مطابق ۲۱۔ شعبان ۵۸ھ پنجشنبہ کو مجھے اور رفیق محترم مولوی سید نجم الحسن خیرآبادی کو بھی یہ سعادت نصیب ہوئی۔ حدیث مصافحہ و ضیافۃ مع اسناد پڑھ کر مصافحہ فرمایا اور "اسودین" پانی اور کھجور سے ضیافت کی۔ اسناد پر دستخط ثبت فرما کر اجازتِ بیعت بھی مرحمت فرمائی۔

مولانا مفتی کفایت اللہ، علامہ سید سلیمان ندوی، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی اور دوسرے اکابر علماء مولانا سے بڑی عزت و احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اول الذکر دونوں حضرات کبھی کبھی فنی و علمی مسائل کی تحقیقی گفتگو بھی کرتے۔

علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم جب یورپ گئے اور وہاں انھیں

لیکچر بھی دینا تھا، تو جناب میر غلام بھیک نیرنگ کی معرفت مولانا سے زمان یا دہر پر مضمون لکھایا تھا۔ اس کی انگریزی کر کے وہاں کی علمی مجلس میں وہ مضمون پڑھا جو بے حد پسند کیا گیا۔ وہاں سے واپسی پر مولانا کو شکریہ کا خط لکھا تھا، مولانا نے ایک موقعہ پر وہ خط مجھے بھی دکھایا تھا، معلوم نہیں اب بھی کاغذات میں وہ محفوظ ہے یا نہیں؟

مولانا کو فلسفہ کے مسائل پر اس قدر عبور تھا کہ اہم سے اہم مسئلہ پر برجستہ گھنٹوں تقریر کر سکتے تھے، میرا ذاتی مشاہدہ ہے۔

شعبان ۵۵ھ میں احمد آباد، سورت اور بمبئی کا سفر ہوا۔ دو دوسرے طالبِ علموں کے ساتھ مجھے بھی ہم رکابی کا فخر حاصل تھا۔ رمضان کا پورا مہینہ تقریباً بمبئی ہی میں گذرا۔ ترمذی شریف اور سراجی کے اسباق جاری رہے۔ کبھی سحری اور کبھی نماز فجر کے بعد یہ سلسلہ رہتا۔ اسی درمیان میں مولانا نے علم و معلوم پر تحقیقی مضمون لکھنا شروع کر دیا۔ نہایت باریک قلم کے ۳۰ صفحات لکھ ڈالے۔ درمیان میں بیسیوں کتابوں اور افاضل کے حوالے دیئے گئے، حالاں کہ ہمارے علم میں ہے کہ ایسی کوئی کتاب اس

وقت مولانا کے پاس نہیں تھی جس سے فائدہ اٹھا سکتے۔ مولانا سے استفادہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مولانا کا سینہ، علوم و فنون کا گنجینہ تھا، علم در سفینہ نہ تھا، افسوس!

آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند

جامع مسجد شاہجہانی درگاہِ معلیٰ اجمیر کی پشت پر خاص محراب کے متصل احاطہ "چاریاری" میں یہ کوہ، عزم و ثبات، پیکرِ علم و علم اور مخزن فضل وکمال ۱۰۔ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ سے آسودہ خواب ہے اور اس کی قبر بھی علمی جلالتِ شان کا پورا مظہر بنی ہوئی ہے، علیہ رحمۃ اللہ تعالی۔

طمع فاتحہ از خلق ندا ریم نیاز
عشق من از پس من فاتحہ خوانم باقیست

نقوش و تاثرات

مولانا محمد اسرائیل مولوی فاضل، منشی فاضل
سابق مترجم السنۂ شرقیہ پشتو اکیڈمی،
پشاور یونیورسٹی
پشاور

ہندوستان کے اکثر علماء اپنے شاگردوں پر انتہائی شفقت اور بے حد مہربانی فرمایا کرتے تھے، مگر خاندان عالیہ خیرآبادیہ کے علماء تو بالخصوص انھیں اپنی اولاد سمجھتے تھے اور اپنی حویلی، مکان یا قریبی جگہ میں ٹھیرایا کرتے تھے، کیوں کہ ان کا مقصد صرف پڑھنا نہیں تھا ساتھ ساتھ صحیح تربیت بھی ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتِ علم سے انھیں جتنا نوازا تھا اس کے متعلق میری ناچیز رائے کیا حیثیت رکھتی ہے، خود ان کی تصنیفات اور تالیفات بتاتی ہیں کہ علم میں ان کو کون سا مقام عطا ہوا تھا۔

غالباً ۱۹۳۱ء کی بات ہے کہ سید عبداللطیف، سید محمد نظیف صاحبان اور راقم حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب ٹونکی سے دہلی مرحوم میں، افق المبین، شفاء اور شرح تجرید پڑھتے تھے۔ خیر

آبادی خاندان میں یہ قاعدہ تھا کہ ان کے ہاں ہفتہ میں دو دن منگل اور جمعہ کو تعطیل ہوتی تھی - ایک دن صفائی بدن وغیرہ کے لیے اور دوسرا دن صفائی ذہن کے لیے، کیوں کہ ہمارا طریقہ مشائیہ اور اشراقیہ سے ممزوج تھا - ہمیں جو پڑھایا جاتا تھا اس پر غور و فکر کے لیے بھی وقت دیا جاتا تھا، غرض یہ کہ رأفت و رحمت کے ساتھ قہر و غضب کا بھی ڈر زیادہ رہتا ہے - فاضل موصوف ہمیں اولاد سے بھی زیادہ محبوب سمجھتے تھے، مگر نازک مزاجی بھی حد سے زیادہ تھی ایک دن کسی بات پر بگڑ گئے اور سلسلہ، تدریس بند ہو گیا - خیر آبادی سلسلے کے متعلمین دوسرے علمی سلسلے سے وابستہ نہیں ہو سکتے - ہفتہ عشرہ تک تو صبر کیا مگر زیادہ دیر تک قطع تعلق برداشت کرنا ناقابل تلافی تھا، اس لیے محترم سید عبداللطیف صاحب تو حضرت استاذ الاساتذ حکیم برکات احمد صاحبؒ اور ان کے قابل فرزند جناب حکیم محمد احمد میاں صاحب تعمدہما اللہ بغفرانہ کی خدمت میں گئے اور میں نے حضرت علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے اجازت مانگی - وہاں سے ارشاد ہوا کہ موصوف ایک سال کے لیے سیال شریف

تشریف لے جارہے ہیں، اس لیے وہاں حاضر ہو جائیں، نیز جب تک ہم نہیں پہنچیں گے موصوف پڑھائی شروع نہیں فرمائیں گے۔

اس اثنا میں حضرت فاضل جلیل صاحب نے ازراہِ عطوفت خود ہمیں منایا اور حسبِ سابق دوبارہ سلسلہء تدریس شروع کیا، تاآں کہ ہم نے مذکورہ کتابوں کے علاوہ قدیمہ اور جدیدہ (شرح تجرید کے حواشی) بھی پڑھ لیے۔

علامۃ الہند کی خدمت میں حاضری

اور

ان کی انتہائی خوشی اور عنایتیں

دو سال کے بعد یکایک، ہم فاضل جلیل صاحب سے اجازت لے کر اجمیر شریف جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ طے یہ ہوا کہ پہلے سید نظیف صاحب جائیں اور جب ان کا خط آجائے گا تو میں اور ان کا چھوٹا بھائی سید بادشاہ (مرحوم) چلے جائیں گے۔ سید نظیف صاحب جب خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت علامہ نے دریافت فرمایا۔ آپ اسرائیل ہیں؟ عرض کیا حضور! میں ان کا چھوٹا بھائی

ہوں ۔ فرمایا اسے فوراً بلاؤ، تب تفصیلی بات چیت ہو گی ۔ چناں چہ انھوں نے مجھے فوراً بلایا اور میں بلا تاخیر عازم اجمیر شریف ہوا اور دوسرے دن علامۃ الہند کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ اتفاق سے وہ وقت ایسا تھا کہ ہمارے دوسرے استاذ بھائی اور شہر کے بعض عمائدین بھی موجود تھے ، اس وقت میری عمر ۲۲، ۲۳ برس ہو گی ۔ حضرت علامہ پلکوں کے نیچے نیچے میری طرف دیکھتے تھے ، مسکراتے بھی تھے اور مختلف سوالات بھی دریافت فرماتے تھے ۔ ہمارے اچانک حاضر ہونے کے متعلق بھی ایک دلچسپ قصہ سنایا کہ " ایک دفعہ رمضان شریف میں ایک صاحب آئے ۔ افطاری کرنے کے بعد کہا کہ کل کی افطاری کے لیے انتظام نہ کریں ، میں افطاری لاؤں گا ۔ اس پر حضرت قبلہ نے اسے دس روپے بھی دیے اور فرمایا کہ گھر میں کہہ دیا گیا کہ آج افطاری کا بندوبست نہ کیا جائے شہر سے افطاری آئے گی ۔ عصر کے ہوتے ہی صاحبِ مذکور کا راستہ دیکھتے رہے ۔ دور سے کوئی آتا دیکھیں اور یہی امید باندھیں کہ لو وہ آ گیا ۔ آخر مغرب کی اذان ہو گئی اور نہ افطاری آئی نہ افطاری لانے والے ۔ فرمایا کہ بہت غصہ آیا کہ عجیب آدمی تھا ۔ اسے ایسا نہیں

کرنا چاہیے تھا۔ بہر کیف وہ دن گزر گیا۔ دوسرا اور تیسرا دن بھی گزر گیا۔ اب ہمارے دل سے یہ بات قطعاً نکل گئی کہ کوئی صاحب افطاری لائیں گے۔ اچانک ایسا ہوا کہ کئی دن کے بعد وہ صاحب بڑے اہتمام کے ساتھ تانگے میں عجیب و غریب افطاری لائے۔ اور سلام کے بعد ہی کہا: لیجیے صاحب! آج افطاری کا مزہ آیا جب کہ آپ کو امید نہ تھی، یا اس دن آیا جب کہ آپ کو حتمی توقع تھی؟ تو جب ہمیں سیال شریف میں آپ کی توقع تھی اس وقت آپ نہ آئے۔ اب جب اچانک آگئے تو ہمیں یہ آنا بہت خوشگوار معلوم ہوا اور انتہائی خوشی اور سرور حاصل ہوا"۔

حضرت علامہ کس لیے مسکراتے تھے؟ فرماتے تھے کہ میرے تصور میں مولوی اسرائیل ایک معمر دراز ریش اور جبہ پوش آدمی ہوگا، حالاں کہ وہ الحمدللہ ایک نوعمر نوجوان ہے۔

حضرت علامۃ الہند کی کرم فرمائیاں

اس کے بعد شام کو مدرسہ حنفیہ صوفیہ میں مدرسین حضرات اور طلباء کے علاوہ مدرسہ کے منتظمین کو مدعو فرما کر تشریف لائے اور ان سے فرمایا کہ مولوی نظیف اور مولوی

اسرائیل سلسلہ، خیرآباد کے متوسلین میں سے ہیں اور فارغ التحصیل ہیں۔ میرے پاس یہ کتابیں پڑھنے ہنیں آئے ہیں یہ کچھ آداب سیکھنے کے لیے آئے ہیں، اس لیے کہ علم تربیت کے بغیر درخت بے ثمر ہے۔ یہ اسی مدرسہ میں رہیں گے، آپ حضرات ان کی انہتائی عزت و احترام کریں۔ ان کی قدر میری قدر ہو گی، ہر چیز میں ان کا خصوصی خیال رکھا جائے، حتیٰ کہ پانی میں بھی!

حاضرین پر اس جملے کا یہ اثر ہوا کہ جیسے سانپ پر ضرب لگا یا جائے اور وہ پیچ و تاب کھائے، اسی طرح جن لوگوں کے سینوں میں حسد کی زہر تھی وہ یہ جملے سن کر غصے اور حسد سے پیچ و تاب میں آ گئے۔ دو تین دن آرام کرنے کے بعد حضرت علامۃ الہند نے ہمیں شرح اشارات، محاکمات اور شرح مسلم الثبوت استاذ الاستاذ علامہ عبدالحق خیرآبادی شروع کرائیں اور بخاری، ترمذی اور صدرا میں دوسروں کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت عطا فرمائی۔ حاسدوں نے باہم مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ ہم بھی درس میں بیٹھیں گے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کل کے بچے محاکمات اور بخاری کس طرح پڑھیں گے۔ چناں چہ ۳۵ کے قریب، سب ہم سے معمر فارغ التحصیل اور بعض

۔۔نیہ حنفیہ کے مدرسین بھی ہمارے ساتھ درس میں شامل ہو گئے ۔ہم نووارد اور کم عمر یہ منظر دیکھ کر سہم سے گئے، مگر اللہ کا فضل اور خود اعتمادی کا جذبہ بھی عجیب چیزیں ہیں - قرء یعنی عبارت ہمیشہ راقم ہی پڑھا کرتا تھا - پہلے دن شرح اشارات کی عبارت پڑھنا شروع کیا - چند سطریں جب پڑھیں تو حضرت علامہ کی پیشانی میں مسرت سے رگیں ابھر گئیں اور جب عبارت ختم ہو گئی تو ہمارے بڑے استاد بھائی مولانا عبدالغفور صاحب نے کہا:

"شاباش !لوگ ایسی عبارت پڑھتے ہیں"

اور بس حاسد لوگوں کے چہروں پر گرد اڑنے لگی -

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے اندر اندر یکے بعد دیگرے سب یہ بہانہ کر کے کھسک گئے کہ چوں کہ محاکمات قلمی کتاب ہے اور ہم نقل ہنیں کر سکتے -

خصوصیت کے لیے ایک اور دلیل

انھیں ایام میں کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کے مظالم کے خلاف مسلمانوں نے علم جہاد بلند کیا اور اسے چلانے کے لیے مجلس احرار وجود میں آگئی - اتفاق سے حضرت علامۃ الھند راجپوتانہ کے صدر

چن لیے گئے۔ بڑے زور شور سے چندے جمع ہونے لگے اور دھڑا دھڑ والنٹیر بھرتی ہونے شروع ہوگئے۔ رات کو جلسہ ہوا۔ حضرت علامہ نے فرمایا:

"اجمیر والو! آپ کے لیے دوسری آزمائش کا موقع آگیا ہے، یعنی جہاد کے لیے کشمیر جانا ہے، جس میں ممکن ہے قید و بند کے علاوہ شہادت کا جام بھی نوش کرنا پڑے اور خوراک کے لیے بھی شاید ایک مٹھی چنے کے سوا اور کچھ نہ ملے۔"

اجمیر والوں کو مولانا صاحب کی ایمانداری کا علم تھا۔ سب نے بیک آواز لبیک کہا اور دو تین یوم میں ایک جتھہ تیار ہوگیا۔ معترضین میں سے چند معمر لوگ ابھی حلقہء درس میں باقی تھے۔ حضرت علامہ نے درس شروع کرنے سے پہلے فرمایا: میاں فلانے! میرا خیال تھا کہ اس جتھے کے ساتھ میں کشمیر جاؤں گا، مگر بعض عوارض کی وجہ سے میں نہیں جا سکتا، آپ بڑے ہیں اس لیے آپ امیر بن کر جائیں۔ میاں فلانے کا چہرہ غم کے مارے فق ہوگیا۔ کہنے لگا کہ حضور! آج تار آئی ہے۔ میری والدہ سخت بیمار ہے۔ فرمایا:

اللہ رحم کرے ۔ تو پھر میاں فلانے آپ چلے جائیں گے ۔ ان بیچارے کا تو حلق سوکھ گیا اور ان کے والد کی بیماری کی خبر آئی تھی ۔ ایک ایک کر کے جب سارے منکر ہو گئے تو پھر فرمایا: اچھا میں ایسے آدمی کو بھیجوں گا جس سے پوچھتا بھی ہنیں، یعنی مولوی اسرائیل! میں خوشی سے اچھل گیا اور عرض کیا: بہ سرو چشم، میں تو حکم کا منتظر ہوں ۔ حکم ہو تو آگ میں بھی کودوں ۔ حضرت علامہ مسکراتے رہے اور اشاروں میں حاسدوں کو سمجھایا کہ دیکھو کچھ بات ہے اس لیے ان کے ساتھ خصوصی محبت کی جاتی ہے ۔

ہم حسبِ دستور مدرسہ آ گئے ۔ مغرب کے وقت حضرت علامہ تشریف لائے ۔ بظاہر یہ خیال کیا جاسکتا تھا کہ مجھے ہدایات دینے تشریف لائے ہیں، مگر ایسا نہ تھا۔ ہم نے چائے سے تواضع کی اور خوشی سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا ۔ چائے نوش فرمانے کے بعد بھری مجلس میں فرمایا: " میں اس لیے آیا ہوں کہ جتھے کے ساتھ میں خود جاؤں گا ۔ بھلا باپ آرام سے گھر میں بیٹھا رہے اور بچوں کو میدان جہاد میں کودنے کو بھیجے، یہ ہنیں ہو سکتا ۔ جتھے کے ساتھ میں بھی جاؤں گا ۔ بوڑھا آدمی ہوں، قید و بند کا عادی! میں نے

عرض کیا" میری بڑی خوش قسمتی ہوتی اگر مجھے جانے کا حکم ہوتا"۔
فرمایا: نہیں آپ تو ہماری طرف سے "صدقہ جاریہ" ہو۔ یہ علمی سلسلہ تو آپ ہی سے وابستہ ہے۔

انہی ایام میں جہاد کا ایک دوسرا کارنامہ

انہی ایام میں ہم ایک دن سبق پڑھ رہے تھے کہ ایک تانگے میں چار معززین متشرع، خوبصورت شکلیں، راجپوتانہ کی پگڑیاں باندھے ہوئے آئے اور دوزانو ہو کر عرض کرنے لگے کہ حضور ہم ریاست رام گڑھ کے مسلمان باشندے ہیں۔ وہاں ایک جامع مسجد ہے جسے راجہ نے ڈھانے کا حکم دیا ہے۔ ہم جمعیۃ العلماء دہلی، کانگریس کمیٹی اور خلافت بمبئی کے دروازوں پر گئے، مگر کوئی ہمارے ساتھ نہ ہوا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر جنابِ والا کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ حضرت والا نے حسبِ معمول تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد سر اٹھایا اور فرمایا:

"عبدالغفور! منادی کرنے والے کو بلاؤ کہ شہر میں اطلاع کرے کہ آج رات کے آٹھ بجے جلسہ ہوگا"۔

یہ عصر کا وقت تھا مگر منادی کرا دی گئی اور وقتِ مقررہ پر

جلسہ منعقد ہوا ۔ دارالخیر اجمیر شریف کے باشندے حضرت علامہ کی بات پر سر دینے کو تیار تھے ۔ موصوف کے خطاب میں بڑی خوبی یہ ہوتی تھی کہ اس میں پیچیدہ اور مغلق الفاظ نہیں بلکہ ان کے عوام کے مطابق ان کو سمجھانے کی کوشش کی جاتی تھی ۔ فرمایا کہ :

"تیسری آزمائش کے لیے تیار ہو جائیں ۔ ریاست رام گڑھ کے ہندو مہاراجہ اور وزیر اعظم نے مسجد جامع کے ڈھانے کا منصوبہ بنایا ہے ۔ کریں گے ایسا کہ ریاست کے ساتھ جہاد کریں گے ۔"

سامعین تیار ہوگئے اور صبح سے ہی اپنے نام درج کرانے کے لیے دھڑا دھڑ آنا شروع ہوگئے اور ظہر کے وقت مہاراجہ کی طرف سے ایک معتمد وفد آیا اور حضرت علامہ سے عرض کیا کہ حضور! مہاراجہ کو آپ کے ارادے کی اطلاع مل گئی ہے ۔ وہ اپنے ارادہ سے دست بردار ہے ۔ یہ ان کے اور وزیر اعظم کے دستخط ہیں علاوہ ازیں انھوں نے مسجد میں توسیع کے لیے زمین اور رقم دینے کی پیشکش بھی کی ہے اور ہنستے ہوئے کہا کہ اب تو آپ جہاد نہیں کریں گے؟ اس کے بعد ریاست کے وہی مسلمان بھی آگئے ۔ ان

باتوں کی تصدیق کی اور دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔

علامۃ الہند کی بے نیازی

غالباً ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے کہ ایک دن ہم آناساگر والے مکان میں سبق پڑھ رہے تھے کہ ایک صاحب اجازت لے کر اندر آگئے۔ مہمان کی شکل سے کچھ معلوم نہیں ہوسکتا تھا کہ کون ہے؟ ڈاڑھی مونچھ اور سر کے بال ندارد اور سادھوؤں کی طرح ایک کپڑے میں ملبوس تھے۔کچھ دیر کے بعد کہنے لگے: صاحب! مجھے آپ سے تنہائی میں کچھ عرض کرنا ہے۔ حضرت نے فرمایا: حاضرین میرے بچے ہیں۔ میں ان سے کوئی بات نہیں چھپا سکتا۔ آپ بلاتکلف جو کچھ فرمانا چاہیں فرمائیں۔ مہمان کہنے لگے: جناب! ہم ہندوستان کے طول و عرض میں کئی صد ایسے لوگ ہیں جنھیں خدا نے مال و دولت سے مالا مال کیا ہے۔ چوں کہ ہم اور ہمارا مال اسی کا ہے، اس لیے ہم نے یہ متفقہ فیصلہ کیا ہے کہ سارے ہند میں پھر ایسی ہستیاں تلاش کریں جو متوکل ہوں اور بلا مزد و بلا احسان خدا کی مخلوق کی خدمت کرتے ہیں۔یہ کام میرے حوالے کیا گیا ہے اور مجھے باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ان ہستیوں میں آپ کی

ہستی سرفہرست ہے۔ لہذا میں اپنی انجمن کی طرف سے آپ کی خدمت میں مبلغ تین صد روپے دستی پہنچاؤں گا اور یہ عہد کرتا ہوں کہ سوائے اللہ اور ہمارے اور آپ کے اور کسی کو خبر تک نہ ہوگی۔

یہ عجیب و غریب تقریر سن کر سب پر سناٹا سا چھا گیا اس کے جواب میں حضرت علامہ نے فرمایا:

"آپ کے اس نیک جذبہ کا میں بہت مشکور ہوں۔ آپ کا نصب العین انتہائی اعلیٰ ہے، مگر افسوس کہ میں اس کے قبول کرنے سے معذور ہوں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ اس مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں۔"

یہ سن کر ان صاحب کے چہرے پر مایوسی کے آثار نمایاں ہو گئے اور دوبارہ نہایت الحاح اور عاجزی کے ساتھ درخواست کی، لیکن دوبارہ وہی جواب ملا۔ صاحبِ مذکور نے اب یہ پیشکش قبول کرنے والوں کے اسمائے گرامی لینے شروع کیے، جن کو ظاہر کرنا میں پسند نہیں کرتا، کہ شاید اس طرح حضرت علامہ متاثر ہو جائیں گے۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ :ہاں !ان کی ضروریات

پوری نہ ہوتی ہوں گی، الحمدللہ یہاں ضروریات ہی سرے سے ہنیں ہیں - میں اور میرے یہ سب بچے ان پابندیوں سے آزاد ہیں - خدا دیتا ہے تو شکر کرتے ہیں اور ہنیں دیتا تو صبر کرتے ہیں - وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے - تو حضرت علامہ نے پھر انھیں سمجھانے کی اس طرح کوشش کی کہ وہ دلگیر ہو کر نہ جائیں - فرمایا کہ دارالخیر اجمیر شریف میں میری کئی حویلیاں تھیں جنھیں میں نے راہِ خدا میں دے دیا - میں آزاد رہنا چاہتا ہوں اس لیے آپ مغموم نہ ہوں - اس کے بعد وہ رخصت ہو کر چلے گئے - اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ ان دنوں ہم اور حضرت قبلہ کے دو بچے میاں عبدالباقی سلمہ اور ان کی ہمشیرہ بی بی کئی کئی دنوں تک فاقوں میں رہتے تھے اور آپ تعجب کریں گے کہ سب کے چہرے نور سے چمکتے تھے - انہی ایام میں حیدرآباد دکن سے دارالترجمہ میں ایک اعلیٰ آسامی کے لیے بلاوا آیا تھا اور سچ یہ ہے کہ ہم سب چاہتے تھے کہ حضرت علامہ تشریف لے جائیں تو سب کے لیے بہتر ہو گا - مگر پہاڑ اپنی جگہ سے ٹلے تو ٹلے - لیکن استقلال اور صبر کے عادی کبھی بھی اپنے مقام عالی ہنیں چھوڑیں گے -

انتہائی سادگی

اسی سال جمعیۃ العلماء ہند کے صدر جناب مفتی کفایت اللہ صاحب گرفتار کر لیے گئے تو نائب صدر حضرت قبلہ اور جناب مولانا حسین احمد صاحب (یہ دونوں صاحبان نائب صدر تھے) کا ایک ہنگامی اجلاس دہلی طلب کر لیا گیا، تاکہ جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد مسلمانوں سے خطاب کر کے اپنے لائحہ سے آگاہ کر دیں چناں چہ دیو بند سے حسین احمد صاحب (مدنی) اور اجمیر سے حضرت علامہ عازم دہلی ہوئے۔ اسٹیشن پر دونوں کی گرفتاری کا سامان کیا گیا تھا۔ بے حد و حساب پولیس اور پولیس افسران موجود تھے۔ دیو بند سے جونہی گاڑی پہنچی اور شیخ مدنی نیچے اترے تو معاً انہیں گرفتاری یا واپس تشریف لے جانے کے وارنٹ دکھائے گئے اور اس طرح جامع مسجد دہلی تک وہ نہ پہنچ سکے، اور حضرت قبلہ مع برادرم مولانا سید منتخب الحق صاحب (حال صدر اسلامک اسٹیڈیز، کراچی یونیورسٹی) اجمیر سے دہلی پہنچے۔ اسٹیشن پر پولیس کا ہجوم ادھر ادھر متحرک دیکھ کر حیرت تو ہوئی مگر حضرت استاذی اور برادرم موصوف دونوں ہجوم میں سے نکل کر تانگے میں بیٹھ کر سیدھے

جامع مسجد دہلی پہنچ گئے اور نماز جمعہ کے بعد پروگرام کے مطابق تقریر کی۔ پولیس حیران رہ گئی کہ آخر مولانا صاحب کیسے پہنچ گئے۔

وہاں حضرت شیخ حضرت حسین احمد صاحب تھے

اور

یہاں فقیر معین الدین تھا

جب دارالخیر اجمیر شریف تشریف لائے تو میں نے متعجب ہو کر عرض کیا: حضور! مولانا حسین احمد صاحب تو دہلی اسٹیشن سے واپس کر دیے گئے اور آپ جامع مسجد تک بخیریت پہنچ گئے اور تقریر بھی فرمائی۔ حضرت قبلہ نے مسکرا کر فرمایا: "ہاں بھئی! وہاں تو حضرت علامہ شیخ حسین احمد صاحب جبہ پہنے ہوئے تھے اس لیے پہچانے گئے اور اپنے مقصد میں ناکام ہو گئے اور یہاں تو فقیر معین الدین تھا۔ نہ جبہ تھا، نہ پگڑی۔ پولیس والے حضرت علامہ معین الدین کو تلاش کر رہے تھے اور اس لیے ہم پر ان کی نظر نہ جم سکی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

"فقیر"

حضرت علامہ اپنے اسم گرامی کے ساتھ "فقیر" اور بعض دفعہ "حقیر" بھی لکھتے تھے اور آخر میں "کان اللہ لہ" ۔ یہ "فقیر" صرف لفظاً نہیں تھا، حقیقتاً ہی موصوف "فقیر طبع" تھے ۔ ایک دفعہ دوران درس میں ایک صاحب نہایت متشرع، خوش شکل، خوش پوش تشریف لائے اور سلام کرنے کے بعد پوچھا "حضرت مولانا علامہ وغیرہ معین الدین صاحب" سے ملنا ہے ۔ حضرت علامہ کے چہرے کی طرف میں دیکھ رہا تھا کہ بہت متغیر ہوا اور فرمایا کہ حضرت فلاں اور فلاں تو نہیں ہیں اور "فقیر معین الدین حاضر ہے ۔"

میں نے ان کی اتباع میں اپنے نام کے ساتھ پہلا لفظ "فقیر" تو نہیں لیا، البتہ آخری الفاظ "کان اللہ لہ" لے لیا ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانہ میں مفتیء ہند مولانا کفایت اللہ صاحب اپنے نام کے ساتھ "غفرلہ" لکھا کرتے تھے، بعد میں انھوں نے بھی "کان اللہ لہ" لکھنا شروع کیا اور آخر تک لکھتے رہے ۔

حضرت علامہ کا علمی تبحر

حضرت علامہ کے علمی تبحر کے متعلق تو میں کیا عرض کر سکتا ہوں، البتہ ایک واقعہ عرض کیے دیتا ہوں۔ ایک دن جب ہم محاکمات پڑھ رہے تھے تو اس مقام سے متعلق میں نے کئی شیخ الرئیس ابن سینا کے رسائل دیکھے اور دل میں یہ خیال کیا کہ کل انشاء اللہ یہ عرض کروں گا۔ حالاں کہ میں نے کبھی بھی ایسی نازیبا حرکت نہیں کی تھی، اس لیے کہ مجھے اپنے اساتذہء کرام (حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب اور حضرت علامۃ الہند اور اسی طرح چند دنوں تک جب میں حضرت استاذ الاساتذ حکیم برکات احمد صاحب رحمہم اللہ کی زیارت کے لیے گیا تھا تو تبرگا جناب حکیم محمد احمد صاحب ابن حکیم صاحب مرحوم و مغفور کے درس میں حاضر ہوتا رہا) پر کامل یقین تھا۔ اس لیے میں یہ حرص کرتا تھا کہ ان کے فیوضات سے مستفیض ہو جاؤں۔ یہ نہیں کرتا تھا کہ کسی بحث میں ان سے الجھوں اور استفادہ سے محروم ہو جاؤں اور یہی وجہ تھی کہ سب مجھ سے زیادہ محبت کرتے اور توجہ دیتے تھے۔ چناں چہ عبارت پڑھنے کے بعد حضرت علامہ کا چہرہء مبارک کچھ متغیر تو ہو گیا

مگر بہت جلد ازراہِ رحمت فرمایا "اسرائیل! مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے رسائل ابن سینا مطالعہ کیے ہیں ۔ شاباش! اسی طرح مطالعہ وسیع کرلو" میں نے فوراً معافی مانگی اور شکر ہے کہ مل گئی ۔ اس کے بعد اس دن پڑھائی تو کیا ہوتی، کتابیں بند کردی گئیں اور اپنے زمانۂ شباب اور درس و تدریس اور آدابِ شاگردی اور استاذی کے تذکرے فرمائے ۔ اور یہ خوشی ہوئی کہ تربیت کے اس پہلو میں، ہم ناقص تھے ۔ شکر ہے کہ یہ تربیت بھی مکمل ہوگئی!

حضرت علامہ فضل حق صاحب رام پوری کی آمد

ہمارے سالانہ امتحان کے لیے علامہ فضل حق صاحب رام پوری تشریف لائے تھے ۔ محاکمات اور شرح اشارات میں سب سے پہلے راقم آگے بڑھا ۔ امتحان لینے کے بعد حضرت علامہ فضل حق صاحب بہت خوش ہوئے اور تعریفی کلمات میں حضرت استاذی مدظلہ کے کام کو سراہ رہے تھے ۔ اتفاق سے ان کے ایک ساتھی کا نام " معین الدین " تھا ۔ انھیں نام لے کر پکارا تو حضرت علامہ آگے بڑھے اور فرمایا "فقیر حاضر ہے " اس پر علامہ رام پوری بہت نادم ہوئے اور فرمایا "آپ تو مخدوم معین الدین ہیں " ۔ یہ

ان حضرات کے اخلاقِ عالیہ کا کمال تھا ورنہ ہر دو حضرات کے مناظرے بھی ہوئے تھے اور شائع بھی ہوئے تھے، مگر چوں کہ علامہ رام پوری عمر میں بڑے تھے اور عالی جناب حکیم برکات احمدؒ کے ہم زمان تھے، اس لیے استاذی مدظلہ بھی ان کی استاذانہ قدر فرمایا کرتے تھے۔

میں پیغام حق پہنچا کر بری ہو گیا ہوں

حضرت علامۃ الہند دارالخیر اجمیر شریف میں دو مکانوں میں سکونت فرمایا کرتے۔ ایک مکان درگاہ شریف حضرت غریب نواز خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کے قریب پہاڑی میں الگ تھلگ مکان تھا۔ راقم جن دنوں حاضر ہوا تھا، ان ایام میں اسی میں سکونت فرماتے تھے۔ یہ وہ مکان تھا جہاں سے ایک تاثر میں مجاہدِ اعظم حضرت استاذیؒ نے درگارہ شریف میں عورتوں، گویوں اور دیگر ناچنے والیوں کے خرافات کو بند فرمایا تھا۔

میں نے خود ایک دن اس کی جسارت کی اور عرض کیا کہ یہ واقعہ بیان فرمائیں۔ واقعہ یوں تھا کہ ایک دن حضرت علامہ اسی صحن میں ہٹل رہے تھے کہ اچانک درگاہ شریف کی طرف دیکھا

تو اس میں جا بجا محفلِ رقص و سرور گرم تھے۔ فرماتے تھے کہ یہ بات مجھے ناگوار معلوم ہوئی کہ ہند کے اولین مبلغ اور مجاہد کے مزار پر ایسی بے حرمتی ہو۔ چناں چہ رات کو جلسہ منعقد کرایا اور اس میں لوگوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ حضرت علامہ اسے بند کریں گے، چاہے اس مقصد میں سر کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ یہ اس لیے فرمایا کہ درگاہ شریف کے قریباً بارہ ہزار خدام تھے، جن کی آمدنیوں کے ذرائع یہی تھے اور دوسرے جو لوگ عادی ہو کر آتے ہیں وہ بھی مخالفت کریں گے۔ مگر عزم صمیم اور اخلاق کے سامنے باطل کو جھکنا ہی پڑتا ہے۔ چناں چہ بات حکام وقت کے کانوں تک پہنچ گئی۔ وہ حضرت علامہ کی ذاتِ گرامی سے واقف تھے۔ کہ یہ وہ "مردِ مؤمن" ہیں جن کے گفتار و کردار میں مخالفت نہیں ہوتی۔ دوسرے دن کلکٹر صاحب اور دوسرے متعلقہ حکام گھر پر آئے اور عرض کیا کہ اگر ان لوگوں کو باضابطہ طور پر حکومت ہی بند کر دے تو پھر بھی آپ جہاد کریں گے۔ حضرت علامہ نے فرمایا کہ: نہیں، پھر تو مقصد حاصل ہو جائے گا۔ چناں چہ راتوں رات حکومت کی طرف سے حکم امتناعی بذریعہ پوسٹر شائع ہو گیا کہ آئندہ

کے لیے کوئی عورت بغیر اپنے محرم کے مزار حضرت خواجہؒ کی زیارت نہیں کر سکتی اور رقاصائیں اور دیگر رقص و سرود اور بھنگ، چرس کے دور قانوناً بند ہیں۔ اس طرح یہ مقدس مقام ان فضولیات سے پاک و صاف ہوگیا۔

جذبۂ حریت

مدرسۂ حنفیہ صوفیہ کے صدر مدرس مولوی عبداللہ صاحب قندھاری، حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے بے حد معتقد اور حضرت علامہ کے شاگرد بھی تھے۔ بڑے اچھے عالم تھے۔ مگر جیل کی صعوبتوں سے بہت ڈرتے تھے۔ پہلی دفعہ جب حضرت علامہؒ نے اجمیر شریف میں "جہاد" کا فتویٰ دے کر مجاہدین کے ہراول میں سب سے پہلے آپ، پھر آپ کے منجھلے بھائی عالی جناب حکیم نظام الدین صاحب اجمیری، محترم حکیم نصیرالدین صاحب، مالک نظامی دواخانہ کراچی اور تیسرے نمبر پر آپ کے چھوٹے بھائی محترم غازی محی الدین صاحب جو مدتوں مولانا شوکت علی صاحب کے دست و بازو رہے ہیں اور اب کراچی میں مقیم ہیں۔ اس جہاد میں کافی انگریز اور ہندو کام آئے تھے اور معدودے چند مسلمان بھی

درجۂ شہادت پا چکے تھے۔ نتیجے میں حضرت علامہؒ اور ان کے دیگر رفقاء گرفتار ہو گئے اور حضرت علامہ پر سزائے موت کا حکم بھی ہو گیا۔ یہ واقعہ حضرت علامہ کی زندگی کا بڑا عبرت ناک اور قوتِ ایمانی کا ایک سبق آموز باب ہے۔ گرفتار شدگان میں مولوی عبداللہ صاحب بھی تھے۔ مولوی صاحب موصوف ابتدائی ایام میں مجھ سے کچھ کتراتے تھے اور ہماری اس قدر دانی کو جو حضرت علامہ نے فرمائی تھی، تعجب کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مگر آخر میں ہمارے کردار نے ان کو گرویدہ بنا لیا۔ میں نے ان سے اس کے متعلق دریافت کیا کہ حضرت! سنا ہے آپ تو اس فتوے پر دستخط نہیں کرتے تھے، پھر کیسے دستخط کیے۔

مولوی عبداللہ نے فرمایا کہ: میں پہلے اس فتوے پر دستخط کرنے سے گریز کرتا تھا، اس لیے کہ میں جیل جانے سے بہت تھراتا تھا۔ مگر ایک رات کو خواب دیکھا کہ حضرت خواجہؒ کے ہاتھ میں یہی فتویٰ ہے اور مجھے حکماً فرماتے ہیں کہ "عبداللہ اٹھو اور اس فتوے پر دستخط کر لو اور آئندہ کے لیے یہ یاد رکھو کہ جس فتوے پر معین الدین کے دستخط ہوں اس پر پہلے (حضرت خواجہؒ) معین

الدین کے دستخط ہوں گے۔" چناں چہ صبح کو میں نے چاروناچار آنکھیں بند کر کے اس فتوے پر دستخط کیے۔ (میں محترم حکیم نصیر الدین صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس عظیم واقعہ کے تمام پہلوؤں پر ایک بسوط مقالہ تحریر فرمائیں)۔

غیبی امداد

حضرت علامہ پر مقدمہ چلانے کے لیے انگلینڈ سے بیرسٹر کو بلایا گیا تھا۔ فرماتے تھے کہ ہندوستان کے تمام مشاہیر مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری اور ریاستوں کے وزراء، سب کے سب اس مقدمے کے لیے اجمیر شریف آئے تھے۔ گاندھی جی تو ویسے بہت آتے تھے، مگر مجھے یاد نہیں کہ اس مقدمے میں ان کا نام لیا تھا یا نہیں۔ بہر کیف جب سزا۔۔۔ ت دیے جانے کا حکم ہوا تو فرماتے تھے کہ سترہ دن آپ نے سلاسل میں بند اکثر کھڑے کھڑے گزارے تھے۔ حکم سنتے ہی سب بہی خواہ انتہائی رنجیدہ ہو کر چلے گئے، مگر اس غیبی امداد کو دیکھیے کہ اجمیر شریف میں آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے نواسے مزار عبدالقادر بیگ صاحب بڑے جری بیرسٹر تھے اور حضرت علامہ کے شاگرد بھی تھے اور

جیل میں بھی کچھ عرصے رہے تھے۔ مرزا عبدالقادر بیگ صاحب سے میں نے خود بھی یہ دلچسپ واقعہ بیان کرنے کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے جرح میں کہا کہ حضرت علامہ کو سزائے موت نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے کہ آمر اور فاعل کی سزائیں مختلف ہیں۔ سزائے موت فاعل کے لیے ہو سکتی ہے آمر کے لیے نہیں دی جا سکتی۔ اس مقصد میں حضرت علامہ آمر کی حیثیت سے ماخوذ ہیں، فاعل کی حیثیت سے نہیں۔ اس لیے فوراً رہا کر دیے گئے۔

من قال لا اله الا الله دخل الجنة ٥ (الحدیث)
کا عملی مفہوم

صحیح بخاری میں یہ حدیث ہے کہ جس نے لا اله الا الله کہا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ یہ اور اس کی مختلف تشریحات جو بخاری کی شروح سے بیان فرمانے کے بعد بھی میں خاموش رہ گیا۔ چوں کہ قاری راقم ہی ہوتا تھا، اس لیے فرمایا کیوں بھئی! تسلی نہیں ہوئی؟ عرض کیا گیا: نہیں حضور! فرمایا: اچھا اب اس کے ایسے عملی معنی بتاؤں گا جس سے تمھاری تشفی ہو جائے گی۔ چناں چہ فرمایا کہ: میرے والدِ ماجد ریاست ٹونک کے مدارالمہام تھے۔ ایک دن

اچانک حکومتِ برطانیہ کا حکم نامہ ملا کہ ریاست ٹونک کی ایک پلٹن ریاست "پالی" (غالباً) چلی جائے،. جہاں چند دیگر ریاستوں کی پلٹنیں بھی آگئی ہوں گی۔ نواب صاحب ٹونک نے والدِ محترم سے فرمایا کہ آپ بھی ساتھ ہو لیں تو بہتر ہوگا۔ فرمایا کہ میں زیادہ عمر کا نہ تھا، مگر میں نے بھی خواہش ظاہر کی۔ والد صاحب نے بھی رضا مندی ظاہر فرمائی، کیوں کہ میرے ہر دو اتالیق بھی ساتھ جا رہے تھے۔ چناں چہ ریاستِ مذکور کو پہنچ گئے۔ کئی پلٹنیں تھیں جن میں بکثرت مسلمان تھے، اس لیے یہ طے پایا کہ ایک مسجد تیار کی جائے جس میں پنج وقتہ اذان اور نماز باجماعت ادا ہو سکے۔ مسجد تیار کر دی گئی اور باقاعدہ اذان اور نماز باجماعت ہونے لگی۔ سوء اتفاق سے کسی وقت انگریز کمانڈر مسجد کی طرف آنکلا، جو بڑا سخت مزاج اور اسلام دشمن تھا۔ مسلمانوں کو یکجا مسجد میں دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا۔ اپنے خیمے کی طرف لوٹا اور فوراً یہ آرڈر کر دیے کہ اس مسجد میں کوئی اذان نہ دے، ورنہ اس کی سزا گردن زدنی ہو گی۔ اس حکم کے ملنے پر تمام نمازی والدِ ماجد کے خیمے میں اکٹھے ہو گئے اور یہ صلاح مشورہ ہونے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ حضرت علامہ

نے فرمایا کہ والدِ محترم کے علاوہ اور بھی بکثرت مسلمان ایسے تھے جن کی کبھی نماز باجماعت قضا نہیں ہوئی تھی۔ تہجد گزار بھی تھے اور ساتھ ہی اشراق گزار بھی۔ کافی دیر تک مختلف رائیں پیش کی گئیں، بالآخر طے پایا کہ مجبوری ہے اور زیادہ سے زیادہ تین دن کیمپ ہو گا، مسجد میں نہیں جائیں گے اور اپنے اپنے خیمے میں نماز پڑھیں گے۔

دو تین وقت جب اذان نہ سنی گئی تو والدِ ماجد کی خدمت میں ایک نوجوان حاضر ہوا۔ سلام کیا اور پھر نہایت ادب کے ساتھ پوچھا: حضور! دو تین وقت سے اذان کی آواز نہیں سنی گئی۔ والد صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر فرمایا: برخوردار! تمھیں معلوم نہیں کہ انگریز کمانڈر نے اذان اور نماز باجماعت پر پابندی لگا دی ہے۔ نوجوان نے پھر استفسار کیا کہ اگر کسی نے اذان دی تو پھر کیا سزا ہو گی۔ فرمایا: "سزائے موت"۔ نوجوان یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ اچھا! موت کے ڈر سے اذان نہیں ہوتی۔ سیدھا مسجد گیا اور "بلالی" صوت میں عصر کی اذان دے دی۔

اذان سنتے ہی ساری فوج میں ایک ہتلکہ مچ گیا۔ نوجوان کو

تو سزا ملی یا نہ ملی، لیکن فرمایا کہ اسی وقت والدِ ماجد کے خیمے سے سارے نمازی اور تہجد گزار جمع ہوگئے اور سب رو رو کر یہ آرزو کرتے تھے کہ کاش! ہماری ساری نمازوں کے بدلے ہمیں اس ایک اذان کا ثواب مل جائے۔ حضرت علامہ نے فرمایا کہ جب تک والدِ محترم حیات تھے یہ واقعہ یاد کر کے روتے تھے اور میرے خیال میں حدیث میں جو لا الہ آیا ہے وہ ایسے وقت میں لا الہ کہنا ہے۔

سنتِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی

جامع ترمذی میں ایک حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دو رکعت سنت پڑھنے کے بعد زمین پر پہلو لگاتے تھے۔ جس وقت یہ حدیث ہم نے پڑھی تو فرمایا کہ تم بھی ایسا کرنا۔ ہمارے محترم رفیق مولانا عبدالغفور صاحب جو علوم نقلیہ و عقلیہ میں یکتائے زمانہ ہیں، نے کہا: واہ! ہم سورج چڑھتے وقت نماز پڑھتے ہیں، اس وقت سنتوں کے بعد لیٹے بھی تو پھر سورج نکل چکا ہوگا۔ حضرت استادی نے فرمایا کچھ بھی ہو، بھئی میں تو اس پر پوری طرح عمل کرتا ہوں۔

حسنِ ظن

کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ حضرت علامہ آنا ساگر والے مکان کے قریب ایک باولی پر تشریف لے جا کر ملحقہ مسجد میں رات کو درس ہمیں دیا کرتے تھے۔ چناں چہ ایک دن جب ہم قریبی قبرستان سے گزر کر باولی کو جا رہے تھے تو ایک قبر آئی، جس پر ایک نہایت خوشخط کتبہ لگا ہوا تھا۔ یہ ایک گویے کی قبر تھی، اس لیے عبدالغفور صاحب نے کہا" شرم نہیں آئی گویوں کی قبروں پر بھی کتبے لگائے ہیں"۔ یہ سن کر حضرت علامہ نے پیچھے مڑ کر فرمایا۔ تمھیں معلوم بھی ہے کہ ان لوگوں میں کیسے کیسے اہل دل بھی ہوا کرتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ ہمارے ماموں صاحب دہلی کی ایک گویے کے متعلق سنایا کرتے تھے کہ وہ بہت شہرۂ آفاق گویا تھی۔ ان کے ہاں بڑے بڑے نامی گرامی لوگ آیا کرتے تھے۔ چناں چہ ایک رات کو دہلی کے چند معززین، جن میں حکیم واصل خاں صاحب بھی شامل تھے، گویے کے ہاں گئے۔ وہ ان گرامی قدر ہستیوں کو دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سمائی اور دبی آواز میں دریافت کیا۔ آپ کی آمد مبارک ہو۔ حاضر شدگان نے گانے کی سفارش کی اور اس

نے بڑے اخلاص کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کیا ۔ یہ محفل اتنی دلچسپ تھی کہ صبح ہو گئی اور انھوں نے اجازت چاہی ۔ اس نے سمع خراشی کے لیے معافی مانگی اور دروازے تک ساتھ گئی ۔ رخصت ہوتے وقت ان میں سے ایک صاحب نے اس کے ہاتھ میں ایک دونی رکھ دی ۔ فرمایا کہ وہ گویا مرتے دم تک یہ واقعہ یاد کر کے روتی تھی کہ میری رات بھر کی پیش کش کی قیمت دو آنے تھی ۔ یہ ان عالی مقام حضرات کی قدر دانی تھی ۔ فرمایا : بتاؤ اگر تمھارے اتنے بڑے کام کا معاوضہ تمھیں ایک دونی ملے تو تم کیا کرو گے ؟ اتنا صبر کر لو گے ؟

بے نیازی کے معنی

حضرت علامۃ الہند کی خواہش تھی کہ مدرسۂ حنفیہ صوفیہ کے لیے زمین کا ایک ایسا خطہ مل جائے جس میں اس کی دیدہ زیب عمارت آسکے ۔ دارالاقامہ ، کتب خانہ اور باورچی خانہ بھی ہو اور دارالتدریس کے کمرے بھی کھلے کھلے آرام دہ بن جائیں ۔ اس کے لیے اجمیر شریف کے ایک سیٹھ صاحب نے ارادہ ظاہر کیا ۔ چناں چہ ایک دن حضرت استاذی راقم کو ساتھ لے کر ان کی دکان پر گئے

سیٹھ صاحب کا نام تو میں بھول گیا ہوں ۔ اتنا یاد ہے کہ ریلوے لائن کے قریب جنوبی جانب ان کی دکان تھی ۔ سیٹھ تعارفِ متجاہلانہ سے کام لے کر ایسے ملے جیسے حضرت علامہ ان کے جانے پہچانے ہی نہیں ہیں ۔ چناں چہ باتوں میں اس نے بڑی بے رخی برتی اور انتہائی استغنائی شان کا مظاہرہ کیا ۔ لفظ لفظ پر بے نیازی اور "مجھے کسی کی کیا پرواہ ہے" کے جملے جوڑتے تھے ۔ اس پر حضرت علامۃ الہند کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور شیر کی طرح گرج کر فرمانے لگے :" سیٹھ، کیا آپ سے ہم بے نیازی اور استغنا کے معنی سیکھنے آئے ہیں ؟ سیٹھ جی یہ معنی تو ہم لوگوں کو عملاً سکھاتے ہیں ۔ اپنی دکان کے اندر کرسی پر بیٹھ کر آپ کسی کی پرواہ نہیں کرتے ۔ پرواہ تو ہم نہیں کرتے کہ بال بچوں اور شاگردوں کو خالی میدان میں اللہ کے آسرے پر چھوڑ کر کشمیر کو جہاد کے لیے جاتے ہیں اور سر ہتیلی پر رکھتے ہیں ۔ آپ دکان اور بچوں کو چھوڑ کر ذرا گھر سے تو نکلیں، تب ہم سمجھیں گے کہ واقعی سیٹھ صاحب بے پرواہ آدمی ہیں ۔ بس یہ فرمایا اور اٹھ کر چلے آئے ۔ سیٹھ صاحب بہت نادم ہوئے ، معافی مانگی ۔ لیکن فرمایا بس ہم آپ سے اب نہیں ملیں گے ۔ آپ

کا کیا خیال تھا کہ ہم آپ سے بھیک مانگنے آئے ہیں اور اس کے بعد حضرت نے کبھی بھولے سے بھی ان کا نام نہیں لیا۔

موقع شناسی

میں نے عرض کیا ہے کہ حضرت علامہ آنا ساگر کے قریب ایک عالیشان مکان یا حویلی میں اقامت گزیں تھے۔ نزدیک ہی پولیس کی ایک چوکی تھی، تاکہ پولیس ہر وقت حضرت علامہ کی حرکات پر کڑی نگاہ رکھے۔ جس دن حضرت علامہ کشمیر کے لیے جتھالے کر روانہ ہو رہے تھے، اس کے لیے طے ہوا تھا کہ مدرسۂ حنفیہ صوفیہ میں مجاہدین اکٹھے ہو کر پہلے حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی درگاہ پر حاضر ہوں گے، زاں بعد اسٹیشن کے لیے روانہ ہوں گے۔ لیکن وقت کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ حکومت تو ہمیشہ ایسے اسباب پیدا کرنا چاہتی تھی کہ کسی طرح ہندو مسلمان آپس میں متصادم ہوں، اس لیے آریہ سماج کو اکسایا کہ وہ بھی جلوس نکالیں یہ توقع تھی کہ مسلمانوں کا جلوس اور آریہ سماج کا جلوس بیک وقت نکل کر کہیں نہ کہیں متصادم ہو جائیں گے۔ چناں چہ ہم سب شرکائے درس حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر تھے کہ

اچانک ایک موٹر آئی - ڈپٹی کمشنر صاحب اور سٹی مجسٹریٹ جو ایک سید مسلمان تھے اور غالباً ان کا نام مسعود احمد تھا - تیسرے پولیس افسر تھے - جونہی انھوں نے کمرے کے اندر قدم رکھا تو حضرت علامہ نے فرمایا: "آئیے سید صاحب آپ کا ورودِ" یہاں سے سید صاحب نے جملہ کاٹ کر کہا: "نا مسعود" فرمایا - اس میں کیا شک ہے - ڈپٹی کمشنر صاحب بیٹھ گئے اور کہنے لگے: "ہمیں آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا ہے - حضرت نے فرمایا: یہ میرے بچے ہیں، ان سے کوئی پردہ نہیں، اس لیے آپ بلا تامل جو کچھ کہنا چاہیں کہیں - انھوں نے کہا کہ کل آپ بھی جلوس نکالیں گے اور آریہ سماج بھی جلوس نکالتے ہیں - ایسا نہ ہو کہ دونوں میں کہیں تصادم ہو جائے - حضرت استاذیؒ نے فرمایا: وہ کس وقت نکالیں گے؟ کہا، دس بجے صبح - تو علامہ نے فرمایا: ٹھیک ہے، ہم تو انشاء اللہ دو بجے نکالیں گے اور اس وقت تک ان کا جلوس ختم ہوا ہو گا - تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ رخصت ہو گئے، تو ہم سے فرمایا: بھئی میں نے تو ان کی اس اچانک آمد سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ حکومت مجھے گرفتار کرنا چاہتی ہے - تو میں کہوں گا کہ میرے ساتھ یہ پانچ آدمی بھی اسی فعل کے

مرتکب ہیں جس کا مرتکب میں ہوں، اس لیے ان کو بھی میرے ساتھ جیل بھیجیں تاکہ تدریس کا سلسلہ جاری رہے۔ لوگ کہیں گے کہ چلو سب جیل گئے اور جب جیل سے تم نکلو گے تو فارغ التحصیل ہو کر نکلو گے۔

یہ حضرت علامہ کی دور اندیشی اور موقعہ شناسی تھی کہ وقتِ جلوس کا تعین نہیں فرمایا تھا، اس لیے حکومت اپنے مقصد میں خاسر ہو کر لوٹی۔ یاد رہے کہ حضرت علامہ کی گرفتاری کے لیے ڈپٹی کمشنر خود آتے تھے اور گھر پر سے موٹر میں بلا ہتھکڑی ڈالے لے جایا کرتے تھے۔

نوٹ:۔ جو کچھ عرض کیا گیا یہ سب چشم دید یا حضرت قبلہ سے سنی ہوئی حقیقتیں ہیں۔ ان میں ممکن ہے کہ کمی تو ہو مگر زیادتی نہیں کی گئی۔

سیلاب سے سبق سیکھیے

غالباً ۱۹۳۴ء کے اوائل میں میں حضرت علامۃ الہند سے اجازت لے کر دہلی آیا اور کچھ ایسے موانعات پیش آئے جن کی وجہ سے میں جلد واپس دارالخیر اجمیر شریف نہ جا سکا۔ اور میں عرض کر

چکا ہوں کہ خاندانِ عالیہ خیرآبادیہ کے اساتذہ، کرام خاص تلامذہ کو بعینہٖ اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ اس لیے حضرت استاذیؒ نے برادر محترم عبدالغفور سے تار دینے کے لیے فرمایا۔ چناں چہ انھوں نے تار کے ذریعے مجھے فوراً بلایا۔ میں نے جواب میں عرض کیا کہ چند موانعات پیش آئے ہیں، خدا کرے یہ جلد رفع ہو جائیں تو حاضر ہو جاؤں گا۔ اس کے جواب میں حضرت علامہؒ نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا:

"تمہاری سعادت مندی کی خاطر لکھا جاتا ہے کہ فوراً اجمیر شریف آکر اپنی تکمیل میں منہمک ہو جائیں۔ تم نے موانعات کے رفع ہونے کے بعد کام شروع کرنے کا لکھا ہے۔ سو یاد رکھنا کہ اس طرح نہ تو موانعات رفع ہوں گے اور نہ تم مقصد پا سکو گے۔ دنیا میں جس کسی نے کچھ رتبہ پایا ہے یا اپنا مقصد حاصل کیا ہے انھیں موانعات میں رہ کر کیا ہے، البتہ جذبہ اور شوق کا ہونا ضروری ہے۔ اگر جذبہ صحیح ہو تو پھر کوئی مانع تحصیل و تکمیل سے

مردوں کو نہیں روک سکتا۔ یہ سبق تم سیلاب سے سیکھو۔ جب سیلاب آجاتا ہے اور اس کے لیے کئی موانعات ہوتے ہیں۔ گڑھے ہوتے ہیں، چٹانیں ہوتی ہیں، درخت اور جھاڑیاں ہوتی ہیں۔ مگر چوں کہ سیلاب میں آگے بڑھنے کے لیے شوق اور جذبہ ہوتا ہے، تو کسی مانع کی پرواہ کیے بغیر جب چل پڑتا ہے تو تمام موانعات کو دور دور پھینک اپنے لیے راستہ ہموار کر لیتا ہے۔ چٹانوں کو پھینکتا ہے، درختوں اور جھاڑیوں کو بیخ د بن سے نکال دیتا ہے اور گڑھوں کو بھر کر ذوق و شوق سے شور کرتا ہوا آگے جاتا ہے۔ اسی طرح اس نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھو: "موانعات" بہانے ہیں، جو جواں مردوں کے ساتھ زیبا نہیں۔ کام کرنے کے لیے شوق پیدا کرو اور موانعات کو کبھی بھی خاطر میں نہ لاؤ اور آگے بڑھو۔ مادی دنیا میں ہمیشہ انقلاب آئے ہیں اور آتے رہیں گے اور کام کرنے والوں نے انھیں میں

رہ کر کیا ہے"۔

اس کے بعد میں کبھی بھی اس ہدایت کو نہیں بھولا اور جس کسی نے ہمت ہارنے یا میری طرح عمل کے لیے بہانے کیے تو میں نے اس کی ہمت باندھی اور حضرت الاستاذی قدس سرہ کی نصیحت دہرائی۔

پرکار کی طرح رہیے

جس زمانہ میں سیاسی تحریکیں زوروں پر تھیں تو اس کا اثر ایسا عالمگیر تھا کہ طلباء بھی اس کی زد میں آئے ہوئے تھے اور یہ بات بڑوں، سرپرستوں اور تجربہ کاروں پر ناگوار گزرتی تھی۔ چناں چہ ایک ایسے موقعہ پر جب کہ ہم میں سے اکثر اپنے بنیادی کام تعلیم اور تحصیل میں سستی کر رہے تھے اور سیاست میں دلچسپی لے رہے تھے۔ حضرت علامہؒ نے فرمایا کہ "پرکار کی طرح رہیے"۔ راقم نے عرض کیا حضور! پرکار کی طرح کیسے؟ فرمایا ایسے کہ ایک پاؤں سے اپنے مقصد پر پرکار کی طرح قائم و ثابت رہیں اور دوسرے پیر سے ادھر ادھر گھومے۔ اس طرح کسی حین اور کسی وقت اپنے اصلی مقصد کے دائرے سے باہر قدم نہ نکالیں۔

دراصل یہی وہ تربیت تھی جس کے عملاً سیکھنے کے لیے ہم خدمتِ عالی میں حاضر ہوئے تھے اور حسبِ موقعہ اور عندالضرورت انھوں نے ازراہِ شفقت صحیح تربیت فرمائی۔ آہ! اب اساتذہ اور تلامذہ کے درمیان وہ محبت اور شفقت کہاں، وہ ماں باپ سے زیادہ مشفق و مہربان اساتذہ اور وہ اولاد کیا غلاموں سے بڑھ کر تابعدار شاگرد کہاں!

اس ضمن میں ایک دوسرا واقعہ یاد آیا۔ ہمارے استاذ الاستاذ حضرت علامہ حکیم برکات احمد صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ (۱۹۲۷ء) میں جب حج بیت اللہ شریف سے واپس تشریف لائے تو میں نے حضرت استاذی عبدالجلیلؒ صاحب سے اجازت لی کہ میں حضرت قبلہ کی زیارت کے لیے ٹونک جارہا ہوں۔ چناں چہ زادِ راہ کا انتظام کرکے میں دہلی سے عازمِ ٹونک ہوا۔ اس زمانہ میں رات کے نو بجے ایک ڈاک گاڑی اجمیر شریف جاتی تھی، اس میں بیٹھ گیا اور بد قسمتی سے غلط ڈبے میں بیٹھ کر راستے میں روک لیا گیا۔ صبح کو دوسری ڈاک میں بیٹھ کر سانگانیر جنکش پر اتر گیا۔ یہاں سے صبح کے وقت آگرہ جاتے ہوئے ایک گاڑی نوائی نام ایک جنکشن میں

ٹونک جانے والوں کو اتارتی تھی۔ میں نابلد اور پریشان ہونے والا یکہ و تنہا تھا۔ تفکرات اور توہمات کچھ تو موروثی تھے اور کچھ تنہائی اور ناواقفیت کا عطیہ ۔ اس ہراسانی کے عالم میں جب میں نوائی میں اترا تو ایک صاحب نے پیچھے سے میری گردن پر ہاتھ رکھا۔ غصہ بھی آیا۔ یہاں کون آیا مذاق کرنے والا؟ مڑکر دیکھا تو وہ ہمارے محترم سید لطیف صاحب تھے۔ بہت خوشی ہوئی اور اللہ کا بہت بہت شکریہ ادا کیا کہ ایسے پریشانی کے وقت میں اس نے رحم فرما کر مجھے بہترین رفیقِ راہ کی رفاقت سے نوازا ۔ وہ حضرت حکیم صاحب قدس سرہ اور ان کے لائق فرزند جناب محمد احمد میاں صاحب دونوں کے شاگرد تھے اور ٹونک میں دو تین سال رہے تھے پھر ان سے پوچھا آپ کیسے آئے؟ کہا کہ کل استاذی عبدالجلیل صاحب نے فرمایا کہ اسرائیل ٹونک گیا ہے، ناواقف بھی ہے اور سفر کی صعوبتوں سے نابلد بھی ہے، نہ معلوم وہ کیسے پہنچے گا۔ چناں چہ میں تمھاری رہبری کے لیے چلا آیا ہوں ۔ (ہمارے اساتذہ کرام کی شفقت ملاحظہ ہو)۔

بہرکیف ہم بس میں بیٹھ کے ٹونک پہنچے اور دوسرے دن

صبح کے وقت مجھے حضرت قبلہ کی خدمت میں پہنچا کر وہ قافلہ بازار میں رہ گئے اور میں خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس وقت بیٹھک میں بڑے بڑے نامی گرامی اور معمر خوش شکل اور خوش شمائل حضرات تشریف فرما تھے۔ مجھ سے خطاب فرمایا: برخوردار کہاں سے آئے ہو؟ عرض کیا حضور دہلی سے۔ کس لیے؟ حکیم قبلہ نے فرمایا۔ عرض کیا گیا: حضور کی زیارت کے لیے۔ اس جملے کے سنتے ہی شفقت بھری نگاہوں سے فرمایا: اچھا تم فاضل جلیل کے شاگرد ہو عرض کیا: جی حضور! حاضرین سے ان کا غائبانہ تعارف کیا اور نیاز مند سے ان کے حلقہء تدریس میں پڑھائی جانے والی کتابوں کے متعلق دریافت فرمایا اور جب میں نے فصوص الحکم کا نام لیا تو اس پر فرمایا "فصوص الحکم بھی"۔ عرض کیا گیا جی ہاں! فرمایا: ہاں، یہ فاضل جلیل کا حق ہے۔

میں رخصت ہو کر سرائے میں گیا جو عالی جناب حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مسافروں کے لیے وقف فرمائی تھی۔ اس کے کمرے بہت ہی اعلیٰ تھے اور خورد و نوش کا نہایت نفیس انتظام تھا۔ دوسرے دن جناب حکیم محمد احمد میاں صاحب

تشریف لائے ۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، کیسے کیسے مہربان لوگ تھے، آہ دنیاے فانی !فرمایا :میاں اسرائیل !رات کو قبلہ حکیم صاحب کو بخار کی تکلیف تھی اور اسی حالت میں مجھے بلا کر فرمایا کہ چھوٹے مہمان کا خیال رکھنا اور اس سے دریافت کرنا کہ وہ کہاں خوش ہے ۔۱۔ گھر پر، ۲۔ مدرسہ میں یا ۳۔ سرائے میں ۔۔جہاں وہ رہے ۔ عمدہ کھانا ملے اور ایک روپیہ (ضرب ٹونک)اسے دیا کرنا۔ چناں چہ میں سرائے میں رہتا تھا اور ایک روپیہ یومیہ مجھے عنایت ہوا کرتا تھا۔

ایک دودھ فروش

دہلی میں رات کے ۱۰، ۱۱ بجے میں ایک پاؤ دودھ پیا کرتا تھا۔ وہی عادت تھی، اس لیے ٹونک میں بھی یہی عمل کرنے لگا ۔ ایک رات ایسا واقعہ ہوا کہ میں ایک دودھ والے کی دکان پر گیا اور ڈیڑھ پاؤ دودھ کے لیے اس سے کہا ۔ اس زمانے میں ٹونک میں غالباً بجلی نہ تھی ۔ دکانوں میں چراغ جلتے تھے، جن کی روشنی مدہم سی ہوا کرتی تھی ۔ دودھ والے نے دودھ میں میٹھا ڈال کر اپنے طریقۂ خاص پر کچھ ٹھنڈا کر رہا تھا ۔ جب دودھ پینے کے قابل بنا تو

کڑھائی سے ملائی کا ایک بڑا ٹکڑا الگ کر کے دودھ میں ڈال رہا تھا کہ میں ہوں ہوں کرنے لگا۔ یعنی میں یہ کہہ رہا تھا کہ اتنی زیادہ ملائی نہ ڈالیں۔ اس نے چپکے سے دودھ کڑھائی میں ڈال دیا۔ مجھے غصہ تو آگیا مگر ضبط کیا اور دل میں کہا کہ آؤ اس سے پوچھ تو لو کہ اس نے دودھ کڑھائی میں کیوں ڈالا۔ چناں چہ میرے سوال کے جواب میں وہ کہنے لگا کہ جو ملائی میں ڈال رہا تھا وہ آپ کے دودھ کا حصہ تھی۔ آپ نے اس کے لینے سے انکار کر دیا تو میں نے دودھ واپس ڈالا، کیوں کہ میں آپ کا حصہ یا حق کس کو دیتا۔ اس کا یہ جواب سن کر میں نے معافی مانگی اور کہا کہ اچھا لائیے دے دیجیے۔

عجب بنفسہٖ

خاندانِ عالیہ کے متوسلین اکثر اپنے اساتذۂ کرام کی تصنیفات درس میں پڑھا کرتے تھے، اس لیے ہمیں بھی مسلم الثبوت، شرح مسلم الثبوت علامہ عبدالحق صاحب خیر آبادیؒ شروع کرائی گئی۔ مسلم الثبوت علامہ محب اللہ بہاریؒ کی تصنیف ہے، جس کی عبارت ایسی مختصر اور جامع ہے جیسے فلسفہ میں باقر داماد کی افق المبین کتاب ہے، مگر ان دونوں فاضلوں میں یہ عجیب

بات ہے کہ خود ستائشی کرتے ہیں ۔ چناں چہ مسلم الثبوت کے مقدمہ میں بھی علامہ مذکور نے ایسے جملے استعمال کیے ہیں جن پر علامہ خیرآبادیؒ نے لکھا ہے ہٰذا عجب بنفسہ (یہ اپنے منہ اپنے کو میاں مٹھو کہنا ہے)۔ اس مقام پر پہنچ کر حضرت اسناذی مولانا معین الدین صاحب مسکرائے اور فرمایا کہ مولوی محمد یونس اجمیری اوران کے دوسرے ساتھی جب اس مقام پر پہنچے تو مولوی یونس نے چپکے سے کہا کہ حضرت علامہ خیرآبادیؒ کا یوں فرمانا بھی عجب بنفسہ ہے ۔ چناں چہ اس پر ہم سب خوب کھل کر ہنسے ۔

بھیا ہم تو ختم ہو گئے

ہمارے اساتذہ کرام کے درس دینے کا یہ قاعدہ تھا کہ درس کے دوران اجنبی آدمی کی آمد کو برداشت نہیں کر سکتے تھے ۔ تقریر کا تسلسل کمبخت ٹوٹ جاتا تھا ۔ ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت علامہ نے فرمایا آج دور جنگل میں پرانی مسجد میں سبق پڑھیں گے ۔ چناں چہ عصر کی نماز کے بعد ہم آناساگر والے مکان سے روانہ ہو کر اس مسجد میں پہنچ گئے ۔ مغرب کی نماز پڑھ کر ہم نے حلقہ بنایا اور حضرت علامہ درمیان میں تھے ۔ عبارت پڑھی گئی اور تقریر شروع

ہو گئی - ابھی خلاصہ مقصد ختم نہیں ہوا تھا کہ اتنے میں کسی طرف سے دو آدمی نمودار ہوئے اور سلام کرتے ہی حضرت علامہ کے سامنے بیٹھ گئے - ان کے بیٹھتے ہی خاموشی طاری ہو گئی اور عجیب بات تھی کہ وہ آدمی بھی خاموش بیٹھے ہوئے ہیں - کچھ دیر تک جب وہ نہ ہلے تو حضرت استاذیؒ نے فرمایا "بھیا ہم تو ختم ہو گئے" اور اس کے بعد سب اٹھ گئے اور چلے آئے - وہ آدمی بھی اندھیرے میں کہیں چلے گئے -

ہم کیا ہیں اور کیا پڑھاتے ہیں

حضرت علامہ قدس سرہ کی یہ عادت تھی کہ دوران تدریس میں سوائے اپنے اساتذہ کرام کے اور کسی کا نام یا ذکر نہیں فرماتے تھے - میری موجودگی میں صرف ایک دن ایسا واقعہ ہوا تھا کہ طبیعت میں جلال آگیا تھا - واقعہ یہ تھا کہ جن دنوں حضرت علامہ کشمیر کے لیے جتھے کی امارت فرماتے ہوئے تشریف لے جارہے تھے تو کمیٹی والوں سے فرمایا تھا کہ محترم سید نظیف صاحب اور راقم کمیٹی والوں کے ساتھ کام کریں گے اور وہ ہماری ضروریات کا خیال رکھیں گے - ہم تو باقاعدہ ان کے ساتھ تعاون

کرتے رہے، لیکن انھوں نے ہمارا خیال نہیں رکھا۔ علامہ صاحب جب بخیر و عافیت جہادِ کشمیر سے واپس دارالخیر اجمیر شریف تشریف لائے تو ایک دن آناساگر والی حویلی کی مسجد میں نماز ظہر کے بعد جب ہم ہدایہ آخرین پڑھنے بیٹھے تو دوران تدریس میں مجھ سے فرمایا "آپ کے کھانے پینے اور چائے وغیرہ کے لیے انتظام باقاعدہ تھا"۔ میں خاموش رہا اور کچھ رنگ بھی متغیر ہو گیا۔ اس سے حضرت علامہ سمجھ گئے کہ کمیٹی والوں نے غفلت کی ہے۔ پہلے تو فرمایا کہ "حسین احمد (صاحب) عالم ہے اور پڑھاتا ہے۔ کفایت اللہ (صاحب) پڑھاتا ہے، چیق الدین پڑھاتا ہے اور سب سیکڑوں روپے تنخواہ لیتے ہیں اور معین الدین (رحمۃ اللہ علیہ) کیا چیز ہے اور اس کے تلامذہ کیا چیز ہیں" اور پھر برادرم عبدالغفوم صاحب سے فرمایا کہ شہر میں اطلاع دو، منادی کراؤ کہ آج رات کے آٹھ بجے جلسہء عام ہوگا۔ میں کمیٹی کو توڑتا ہوں اور کل سے تین صد روپے اپنے لیے اور آپ سب کے لیے پچاس پچاس روپے مقرر کروں گا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ رات کے آٹھ بجے جلسہ ہوا اور ہمیں اسٹیج پر مدعو فرمایا اور کلمہء طیبہ پر ایک بے نظیر تقریر فرمائی۔ تقریر کے بعد کمیٹی والوں

سے فرمایا۔ اچھا آپ لوگوں کے ساتھ انھوں نے کام کیا تھا۔ انھوں نے کہا: جی ہاں !! انھوں نے تو بہت اچھا کام کیا۔ تو پھر فرمایا: آپ لوگوں نے ان کا خیال رکھا؟ یہاں آکر وہ خاموش ہوگئے، تو فرمایا: اچھا میں کمیٹی توڑتا ہوں۔ اور پھر ہمارے لیے دارالعلوم صوفیہ حنفیہ کی طرف سے مشاہرہ مقرر کیا۔

یہ آپ ہی کی امانت تھی

دہلی میں کئی مقامات پر پرانی کتابیں فروخت ہوتی تھیں اور ہر فن کے نوادرات ان میں ملتے تھے۔ چناں چہ مجھے حضرت استاذ الاساتذ مولانا فضل حقؒ کا حاشیہ قاضی مبارک اور استاذ الاساتذ مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادیؒ کا حاشیہ حمداللہ انہی مقامات میں دستیاب ہوئی تھیں۔ اسی طرح فصوص الحکم قلمی اور قلندر علی صاحب کی امتناع النظیر کے دو نسخے بھی۔ غرض یہ کہ جب ہم اجمیر شریف آئے تو یہی طلب جاری رہی۔ چناں چہ ایک دن جب ہم ایک وسیع و عریض حویلی میں پہنچے تو وہاں پرانی اشیاء کے ساتھ ساتھ کتابیں بھی فروخت ہوتی تھیں۔ ان کتابوں میں حضرت خاتم الولایت شیخ محی الدین ابن عربی کی تفسیر بھی پڑی ہوئی تھی، مگر ہم

سے پہلے ایک اور صاحب پہنچے ہوئے تھے جو دکاندار سے سودا کر رہے تھے۔ یہ باتیں سن کر برادرم سید نظیف صاحب اور میرے چہروں پر کئی رنگ آئے اور کئی گئے۔ دکاندار بھی سمجھ گیا کہ اصل حقدار یہی لوگ ہیں۔ چناں چہ ان کا سودا نہیں بنتا تھا نہ بنا۔ دکاندار بیس روپے مانگتا تھا اور وہ دس بارہ تک دے رہا تھا۔ یہ وقت جس طرح ہم پر گزرا اس کا اندازہ علم کا ہر شائق لگا سکتا ہے۔

خریدار جب چلا گیا تو ہم دکاندار کے پاس آ گئے اور کتاب ہاتھ میں لے کر اس سے کہا کہ صاحب! اس کتاب کی قیمت نہ بیس روپے ہے نہ تیس، ہمارے عقیدے کے مطابق اس کی کوئی قیمت نہیں۔ لیکن افسوس کہ ہمارے پلّے صرف بارہ ہی روپے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو عنایت کریں اور نہ چاہیں تو پھر بھی کتاب تو کسی حالت میں نہیں چھوڑتے۔ پھر اپنا سامان اور کپڑے فروخت کر کے آپ کی قیمت پوری کریں گے۔ یہ باتیں سن کر مالک مکان کہنے لگا کہ میں نے آپ لوگوں کے چہروں سے معلوم کر لیا تھا کہ آپ ہی اس کے اہل ہیں، اس لیے میں یہ کتاب آپ کو انہی بارہ روپے میں بخوشی دیتا ہوں۔ ہم نے کہا: اللہ تعالیٰ اس ناچیز رقم میں آپ

کے لیے برکت عطا فرمائے، اور اڑ کر وہاں سے چلے آئے۔ راستے میں وہ صاحب ملے جو ہم سے پہلے لینا چاہتے تھے۔ پوچھا کتاب آپ نے لے لی؟ ہم نے کہا ہاں۔ کہا کتنے میں؟ ہم نے کہا: بابا اس کی قیمت تو نہیں ہے۔ اس کی قیمت اس کی "قدر" تھی۔ دوسرے دن حضرت استاذیؒ کو معلوم ہوا تو صرف اس کی زیارت کے لیے مدرسہء حنفیہ صوفیہ میں تشریف لائے اور جب کتاب ہاتھ میں اٹھائی تو فرمایا: "مبارک ہو"۔ میں نے عرض کیا: حضور! ہم اسے نذر کرنے کو تیار ہیں۔ فرمایا: نہیں نہیں! یہ آپ ہی کی امانت تھی۔ خدا آپ کو مبارک کرے اور اس کے علوم سے مستفیض کرے۔ میں نے پھر نذر کرنے کے لیے عرض کیا، تو فرمایا: کیا ہم اجمیر میں نہیں رہتے تھے؟ یہ تو آپ کی امانت تھی آپ کو مل گئی۔

کامل ایمان اور استقلال

اس موضوع پر ایک دن معرکتہ الآرا تقریر فرمائی اور اس سلسلہ میں ایک واقعہ بیان فرمایا کہ آپ کے والدِ محترم جب ریاست ٹونک میں مدیر المہام تھے تو اکثر شکار کا پروگرام بناتے تھے ایک دن چند رئیس زادے حاضر ہوئے اور پروگرام طے ہوا کہ کل

صبح انشاء اللہ نماز فجر کے بعد ناشتہ کر کے شکار کے لیے جائیں گے۔ نماز اور ناشتہ سے جب فراغت ہوئی تو اچانک تار آگیا کہ حضرت علامہ کی ہمشیرہ دار الخیر اجمیر شریف میں انتقال فرما گئیں۔ حضرت علامہ نے فرمایا کہ اس وقت تمام شرکاء شکار جمع ہو گئے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی سب نے یہ رائے دی کی بس اب پروگرام منسوخ ہے۔ لیکن والد صاحب نے تھوڑی دیگر سر بگریباں کرنے کے بعد فرمایا کہ :پروگرام منسوخ ہنیں کرتے، اس لیے کہ اب ہمارا اور متوفیہ کا مادی رشتہ کٹ گیا اور صرف روحانی وابستگی باقی ہے۔ یعنی یہ کہ خمس الاوقات ان کی مغفرت کی دعا مانگیں۔ سو اللہ کا شکر ہے کہ ہم سب مسلمان ہیں، پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کرتے ہیں، حضر ہو یا سفر۔ لہذا ہمیں شکار کے لیے حسب پروگرام جانا چاہیے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ آپ تمام ساتھیوں سمیت شکار کے لیے گئے اور ہر نماز کے بعد ان کی مغفرت کے لیے دعا فرماتے تھے۔

یادیں

مولانا عبدالغفور مرحوم
بنیر، (سرحد)

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا صاحب مرحوم کے ذریعہ دنیا میں بہت اچھے اچھے کام کرائے ہیں ۔ اول اول تو بہ موجب آیۃ کریمہ وانذر عشیر تک الاقربین اجمیر شریف میں دو مدرسے قائم کیے، جو علم دین کے دو چشمے ثابت ہوئے ۔ ایک مدرسہء معینیہ عثمانیہ اور دوسرا مدرسہء حنفیہ صوفیہ ۔ اطراف عالم سے تشنگان علم آئے اور وہاں سے سیراب ہو کر اپنے اپنے ملک کو واپس چلے گئے، جن میں سے ایک میں بھی ہوں ۔ خود میرے ساتھ درس میں شریک افغانستان، بخارا، ترکستان، ایران کے طالبِ علم تھے جو میرے ساتھ فارغ ہو گئے اور اپنے اپنے ملک میں بہت اچھی زندگی بسر کرتے ہیں اور علم دین کی خدمت میں مشغول ہیں ۔ ہندوستان میں جتنے بڑے بڑے شہر ہیں کوئی بھی حضرت مولانا

صاحب مرحوم کے شاگردوں سے خالی نہیں، بلکہ بعض نے تو خود مدرسے قائم کیے ہیں، جن میں بہت طالبِ علم علم دین حاصل کر رہے ہیں - جیسا کہ حضرت مولانا صاحب مرحوم کو علم دین سے عشق تھا ایسا ہی ان کے شاگرد بھی ہیں -۔جہاں بھی ہیں علم ہی کے مشغلے میں مشغول ہیں - ان میں کوئی مدرسے کا بانی ہے، کوئی مدرس ہے، کوئی قاضی ہے - مجھے یقین ہے کہ حضرت مولانا صاحب مرحوم کی روح مبارک کو اس سے بہت خوشی ہو گی - چوں کہ حضرت مولانا صاحب مرحوم کا یہ عقیدہ تھا کہ ہر مسلمان کی زندگی کا مقصد اعلاے کلمۃ اللہ ہے تو جہاں تک حضرت مولانا صاحب مرحوم خود بنفس نفیس کر سکتے تھے وہ تو کرتے ہی تھے، مگر جو جماعت یا شخص اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے میدان میں آتا حضرت مولانا صاحب مرحوم ان کے ساتھ ہو جاتے اور اس میں جتنی تکلیفیں پہونچتیں وہ برداشت کرتے اور کسی قسم کے نقصان کی پروا نہ کرتے - خود اجمیر شریف میں حضرت خواجہ بزرگ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں رنڈیوں کا ناچ ہوا کرتا تھا، اور اس کے منع کرنے کے لیے کوئی شخص جرأت نہیں کر سکتا تھا - چوں کہ ایسے

پاک دربار میں یہ فاحشات بڑی بدنامی کا سبب بنی تھیں، تو
حضرت مولانا صاحب مرحوم نے اس کے روکنے کا ارادہ فرمالیا۔
اول تو خدام صاحبان کو بہت سمجھایا، جب وہ کسی طرح نہ مانے تو
پھر شہر کے عام مسلمانوں کو دربار پر قبضہ کرنے کے لیے تیار کر لیا
کہ اگر خادموں نے رنڈیوں کا ناچ گانا منع نہیں کیا تو پھر دربار پر
قبضہ کرلو۔ جب خادموں کو یہ معلوم ہوگیا تو ایک دم حکومت کی
طرف سے یہ حکم حاصل کر لیا کہ رنڈیوں کا ناچ گانا منع ہے، بلکہ
دربار میں جب رنڈی آئے گی تو برقع پہن کر آئے گی، بغیر برقع کے
نہ آئے گی۔ اسی طرح شکرانے کی حالت تھی۔ جب کوئی زیارت
کرنے والا آتا تو خادم اس کو جگہ جگہ لے جاتے تھے اور ہر جگہ پر
شکرانے وصول کرتے تھے، یہاں تک کہ زائرین کو دعا کرنے کی
فرصت نہیں ملتی تھی تو اس کے لیے بھی حضرت مولانا صاحب
مرحوم نے کوشش کی، یہاں تک کہ حکومت کی طرف سے
شکرانے کا صندوق مقرر ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایک سرکاری
نوکر مقرر ہوا جو صندوق کے قریب کھڑے ہو کر یہ آواز دیتا ہے کہ
جن کو شکرانہ ڈالنا ہو اپنے ہاتھ سے صندوق میں ڈالیں۔ جب یہ

انتظام ہوا تو زائرین کو آرام سے دعا مانگنے کا موقع ملا۔ اس طرح حضرت خواجہ بزرگ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دربار کی تطہیر ہوئی یہ واقعات میرے سامنے کے ہیں کیوں کہ حضرت مولانا صاحب مرحوم کی خدمت میں بہت عرصہ رہا ہوں۔ جس طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دس سال تک رہے تاکہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم سے علم دین حاصل کریں اسی طرح میں حضرت مولانا مرحوم کی خدمت میں بیس سال رہا اور درس نظامی کی سند حضرت مولانا صاحب مرحوم سے حاصل کی۔ میں چوں کہ حضرت مولانا صاحب مرحوم کے ساتھ حضر اور سفر میں رہا ہوں اور بہت سے واقعات میرے سامنے ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ رنگون جانے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت مولوی مظہر الدین صاحب اڈیٹر اخبار الامان دہلی بھی ساتھ تھے۔ رنگون پہونچنے کے بعد جب مسلمانوں نے وعظ کے جلسوں کا انتظام کیا اور جلسے شروع ہوئے تو مولوی مظہر الدین صاحب ہر جلسے میں پیش پیش رہتے تھے۔ یعنی حاضرین پر یہ اثر ڈالتے تھے کہ میں ہی سب کچھ

ہوں۔ کسی کو علمی، اخباری یا اور کوئی معلومات حاصل کرنا ہوں تو مجھ سے پوچھے۔ رنگون کے تعلیم یافتہ لوگوں کو یہ بات بہت بری معلوم ہوئی اور حضرت مولانا صاحب مرحوم سے عرض کیا کہ ہم تو آپ کے وعظ سننے کے لیے یہاں جمع ہوتے ہیں، آپ خود وعظ فرمایا کریں اور مولوی مظہر الدین صاحب کو زیادہ باتیں کرنے سے منع کریں۔ تو حضرت مولانا صاحب مرحوم نے مولوی مذکور کو تنہائی میں بہت سمجھایا کہ اپنے درجے سے آگے مت بڑھنا ایسا نہ ہو کہ کوئی بری حالت پیش آئے، تو مولوی مظہر الدین صاحب نے جواب دیا کہ ابھی سے آپ نے میری عزت پر رشک کیا، ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے، میں دہلی واپس جاکر ایک جمعیۃ العلماء ہند بناؤں گا اور مولوی کفایت اللہ صاحب کے مقابلے میں اس کا صدر بنوں گا۔ چناں چہ جب رنگون سے واپسی ہوئی تو واقعی مولوی مظہر الدین صاحب نے ایک جمعیۃ العلماء رجسٹرڈ بنائی اور خود اس کے صدر بنے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد بیچارے اس طرح قتل ہوئے کہ روز روشن میں اپنے ہی دفتر میں سر تن سے جدا کر دیا گیا اور قاتلوں کا کوئی پتہ معلوم نہ ہوا۔ مولوی صاحب غریب بھی ختم ہوئے اور

مولوی صاحب کی جمعیۃ بھی ختم ہو گئی ۔ نادر. بجا ماند نے نادری ۔

تحریکِ احرار کے زمانے میں جب مسلمانوں نے کشمیر کی طرف جتھے بھیجنا شروع کیے اور حضرت مولانا صاحب مرحوم کو یہ معلوم ہوا کہ یہ مظلوموں کی امداد ہے اور اس کی یہی صورت ہے کہ میں بھی ایک جتھا اجمیر شریف سے لے کر کشمیر کو روانہ ہو جاؤں چناں چہ ایسا ہی کیا ۔ جب لاہور پہونچے تو حکومت نے سب کو وہیں روک دیا ۔ میں چوں کہ جتھے کے ساتھ نہیں گیا تھا تو اجمیر شریف سے ان کے لیے خرچ لے کر لاہور پہنچا ۔ حضرت مولانا صاحب مرحوم دفتر احرار میں مقیم تھے ۔ چوہدری افضل حق صاحب جو جماعت احرار کے ڈکٹیٹر تھے مجھے لاہور میں روکنا چاہتے تھے اور یہ کہا کہ جب تک مولانا صاحب یہاں ہیں تم بھی رہو ، یہاں کام بہت زیادہ ہیں ۔ لیکن مولانا صاحب مرحوم نے مجھے اجمیر شریف واپس بھیج دیا ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی جماعت بھی مسلمانوں کے فائدے کے لیے کھڑی ہو جاتی تو حضرت مولانا صاحب مرحوم اس میں شامل ہو جاتے ۔

علم دین کی تبلیغ میں ہر چند تکالیف حضرت مولانا صاحب

مرحوم کو پہنچتی تھیں، وہ خوشی سے برداشت کرتے تھے۔ خصوصاً ایسے مقامات میں کہ جن میں علم دین کی اشد ضرورت ہوتی تھی۔ جیسے اولیاء اللہ رحمہم اللہ کی درگاہیں ہوئیں۔ سیال شریف جو پنجاب میں بہت بڑی گدی ہے اور حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب مرحوم کا پیر خانہ بھی ہے۔ جب خواجہ قمرالدین صاحب سجادہ نشین سیال شریف نے حضرت مولانا صاحب مرحوم کو درخواست بھیجی کہ میں بوجہ گدی نشینی کے اجمیر شریف نہیں آسکتا، اگر جناب سیال شریف تشریف لے آئیں اور آپ کی وجہ سے میری علم دین کی تکمیل ہو جاوے تو بہتر ہوگا۔ تو حضرت مولانا صاحب مرحوم سیال شریف تشریف لے گئے اور اس وقت تک وہیں رہے جب تک خواجہ قمرالدین صاحب کی دستار بندی نہیں ہوئی۔ جب دستار بندی ہو گئی تو حضرت مولانا صاحب مرحوم اجمیر شریف واپس تشریف لائے۔ ہندوستان میں جتنی قومی تحریکیں چلیں حضرت مولانا صاحب مرحوم سب میں شریک ہوئے، مگر ان کے بیان کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ حضرت مولانا صاحب مرحوم کی زندگی کا عظیم الشان واقعہ ان کے سفر حج میں پیش آیا جس کو وہ خود بیان

فرماتے تھے ۔ واقعہ یہ ہے کہ عبدالعزیز ابن سعود جو اس وقت زندہ تھے اور حجاز کے بادشاہ تھے ۔ انھوں نے قبر پر جو آبادی تھی ، خواہ وہ گنبد کی شکل پر تھی یا چوکور ، سب گرادی ۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پر آبادی کے گرانے کا حکم دیا ہے لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر جو گنبد ہے اس کو بھی گرانا چاہیے ۔ ابن سعود کے جو قاضی القضاۃ تھے ان کا نام تھا حافظ وھبہ ، انھوں نے یہ فتویٰ دیا تھا ۔ ابن سعود چوں کہ بہت عقل مند انسان تھا ، اس لیے اس نے حافظ وھبہ کے فتویٰ پر عمل نہیں کیا ، بلکہ علماء اسلام سے اس بارے میں فتویٰ طلب کیا اور یہ اعلان کیا کہ علماء اسلام میں سے جو بڑے بڑے عالم ہیں وہ مکہ شریف آکر حافظ وھبہ سے اس بارے میں بحث کریں ۔ چناں چہ اس سال اسلامی ملکوں سے بہت سے عالم حج کے لیے گئے ۔ ہندوستان سے بھی بہت سے علما گئے تھے ، مگر یہ دو شخصیتیں قابل ذکر ہیں ۔ ایک حضرت مولانا معین الدین صاحب اجمیری کی اور دوسری حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب دہلوی کی ۔ جب حج ختم ہوا تو ابن سعود نے تمام علما حاضرین کو دعوت دی ۔ اس میں

بحث کا بھی انتظام تھا ۔ تمام علما نے علماء ہند پر اتفاق کیا ۔
حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب جو بہت موقع شناس تھے ،
انھوں نے حضرت مولانا صاحب مرحوم کو بحث کے لیے منتخب کیا
حضرت مولانا صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ اس وقت میں بہت
فکر مند ہوا ، لیکن موقع پر کیا کرتا ۔ حافظ وھبہ کی یہ دلیل تھی کہ
حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ مجھے حضور اقدس
صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ قبر پر جہاں آبادی دیکھو
ویران کر دو ۔ میں نے بخاری شریف کا حوالہ دے کر کہا کہ حضور
اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کو آبادی میں دفن کیا ہے ۔ اس موقع پر
حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ بلکہ عشرہ مبشرہ سب موجود تھے ۔
تو حافظ وھبہ کو غصہ آیا اور کہا کہ میں قول رسول بیان کرتا ہوں اور
تم ابو بکرؓ، عمرؓ کا فعل بیان کرتے ہو ۔ تو اس موقع پر ابن سعود نے
کہا کہ دین اسلام کو تو ابو بکرؓ اور عمرؓ نے روشن کیا ہے ۔ اس لیے ان کا
فعل معمول ہو گا ۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ
علیہ وسلم کے گبند کو ویران ہونے سے بچا لیا ۔ اللہ تعالیٰ نے
حضرت مولانا صاحب مرحوم کے ذریعہ بہت کارِ خیر انجام دیے ہیں

اور ان میں سے بہت بطریقہ، باقیاتِ صالحات موجود ہیں ۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا صاحب مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائیں، آمین ثم آمین۔

حکیم محمود احمد برکاتی کی دوسری تالیفات

قرابادین برکاتی (زیر طبع)

سفر و تلاش (مجموعہ مقالات)

شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان

فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون

حیات شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی

اتقان العرفان فی ماہیۃ الزمان (ترجمہ)

الروض المجود فی تحقیق حقیقت الوجود (ترجمہ)

مولانا حکیم سید برکات احمد سیرت و علوم

مولانا معین الدین اجمیری کردار و افکار

برکات اکیڈمی کراچی

۲۹۸۔ اے، لیاقت آباد نمبر ۴، کراچی ۷۵۹۰۰